جلد ۱۰۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ ترجمہ

اسلامک یونیورسٹی مدینہ منوّرہ

کی

تصانیف

⊖ وجودِ باری تعالیٰ اور توحید	۶۰/- روپے
⊖ رسولِ اکرمؐ کی شادیاں اور ان کا پس منظر	۸/- 〃
⊖ مقصدِ حیات اور اس کا حصول	۸/- 〃
⊖ جرائم کے اسباب (ایک نفسیاتی تجزیہ)	۶/- 〃
⊖ نشہ اور اس کا حتمی علاج (ایک نفسیاتی جائزہ اور عملی تدابیر)	۶/- 〃
⊖ حقیقتِ دعا	۹/- 〃
⊖ توبہ کی حقیقت	۶/- 〃
⊖ احیائے دین کی اساس	۸/- 〃
⊖ اسلام اور محمدؐ پر بہتانات (عربی) (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں جہالت اور بغض پر مبنی ۲۴ الزامات اور غلط بیانیوں کا مدلل جواب)	۲۰/- 〃
⊖ 〃 〃 〃 〃 (اردو)	۲۰/ 〃
⊖ 〃 〃 〃 〃 (انگلش)	۲۰/- 〃

ملنے کا پتہ

○

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ رحمان مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۸	اکتوبر ۱۹۸۷ء مطابق صفر المظفر ۱۴۰۸ھ	عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ۶۸۶۳۶ — ۳۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

"وفیات"

اے کہ براہِ مرگ تن تا بہ جناں رسیدۂ

اے کے بروہی صاحب بھی رخصت ہو گئے - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ -

ستمبر کا مہینہ فی الحقیقت ہمارے لیے تو ستم بر ہی ہے۔ بہت سے ناوک اسی مہینے میں کھائے - بھارتی جارحیت کے وار سہے، مولانا مودودیؒ کی رحلت کا زخم اُٹھایا - محترمہ حمیدہ بیگم جدا ہوئیں - اور اے کے بروہی صاحب کے لیے قدرت نے دُنیا کو چھوڑنے کا یہی مہینہ پسند کیا - ۱۲ ستمبر کو لندن میں وفات اور ۱۶ ستمبر کو کراچی میں تدفین ہوئی -

اے کے بروہی صاحب آج کے ماحول میں انسانیت کا ایک خوبصورت نمونہ تھے - ان کے ذوقِ علم کا اندازہ مجھے (ADVENTURE IN SELF EXPRESSION) کو پڑھ کر ہوا - ان کی قانونی بصیرت دستور ۱۹۵۶ء کی اہم دفعات کی تشریح اور بنیادی حقوق کے تحفظ کی وضاحت کرنے سے نمایاں ہوئی، جب کہ وہ وزیرِ قانون تھے - ان کی جمہوریت دوستی کا یہ عالم تھا...... کہ مولانا مودودیؒ، ان کے رفقاء اور جماعتِ اسلامی کے خلاف جب کبھی مستبدانہ قانون کا وار ہوا تو بروہی صاحب مظلومین کی حمایت کے لیے میدانِ عدلیہ میں آ گئے - ان کے ذہنی علو کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وزارتِ قانون کے زمانے میں ایک بار انہوں نے اس بات کا انکار کیا کہ قرآن مجید سے کسی اسلامی دستور کی دفعات مل سکتی ہیں - لیکن جواباً جب حقائق اُن کے سامنے رکھے گئے تو انہوں نے علی الاعلان اپنے موقف سے رجوع کر لیا -

قرآن اور دین سے ان کی محبت اس تقریر سے ظاہر ہوتی ہے جو تفہیم القرآن کی تقریب میں انہوں نے کی تھی - مضبوط ضمیری کا یہ عالم تھا کہ بھٹو دَور میں ان کو حکومت کی طرف کھینچنے کی بہت کوشش کی گئی اور اس سلسلے میں ان کے مکان پر حملہ تک کرا دیا گیا، مگر بروہی صاحب کے پائے استقلال کو لغزش نہ آئی - ان کی محبتِ پاکستان کا معیار یہ تھا کہ وہ سندھی ہو کر پورے مُلک اور دینِ اسلام کا فروغ چاہتے تھے -

ہر چند کہ وہ جماعتِ اسلامی سے بہت سے اُمور میں اتفاق اور مولانا مودودیؒ (باقی بر صفحہ ۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

بات بڑی سادہ سی ہے۔
ایک شخص کہتا ہے کہ دس جمع دس، بیس ___ اکیس نہیں ہو سکتے ___ اور سب لوگ مان لیتے ہیں اور اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ اور سب لوگ قرنوں دس جمع دس بیس کہتے ہوئے اپنے سارے معاملات چلاتے ہیں۔ اپنی جگہ وہ ٹھیک بھی ہوتے ہیں۔
مگر ایک دن یکایک ایک نیا آدمی اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو! چھوڑو، دس اور دس، بیس کو ___ آج سے تم ایک نیا نسخہ استعمال کرو ___ دس ضرب دس مساوی سَو۔ بس اب کام اس ذہن سے کرو۔
سب چونکتے ہیں، ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں، مسکراتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہے کہ دس ضرب دس سے ایک سو بن جاتا ہے۔
اتنی بات سے ذہنی انقلاب واقع ہو گیا، نیا طرزِ فکر، نیا طریقِ کار اور نئے نتائج

(بقیہ صفحہ ۲) سے گہری محبت کرنے کے باوجود کچھ مسائل میں الگ طرزِ فکر بھی رکھتے تھے۔ مثلاً اُن کا ایک خاص رنگِ تصوف تھا۔ لیکن بایں ہمہ وہ ہمارے لیے بہت اچھے جذبات رکھتے تھے اور ایک اچھے مسلمان اور بہت ہی شائستہ و حلیم انسان تھے۔

ادارۂ ترجمان القرآن کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی رُوح پر انوارِ رحمت کی بارش نازل فرمائے اور ان کے پس ماندگان اور محبوں کو صبر بھی عطا کرے اور اسی طرح کا روشن کردار بھی، جو دین کی خدمت، انسانیت کی تعظیم اور وطن کی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔

معاشرے کا قافلہ مدت تک کسی خاص ڈگر پر چلتا رہتا ہے۔ ایمان، جذبات، شعور، رسوم، عادات سب پر برف کی ایک تہ جم جاتی ہے۔ برف باہر نہیں، انسانوں کے اندر گرتی ہے۔ نتیجہ ہوتا ہے جمود۔ حرکت بھی جمود زدہ ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا ارتقا، تمدن کی ترقی، علوم کا فروغ، سیاسی قوت کا ابھار، اخلاقی چراغوں کی روشنی کا پھیلاؤ، سب کچھ رک جاتا ہے اور مدتوں رکا رہتا ہے۔ بس قافلہ چلتا رہتا ہے، کوئی راستہ ہو نہ ہو، کوئی منزل ملے نہ ملے۔

پھر کوئی ایک شخصیت نمودار ہو کر ایسی انقلاب آفریں صدا لگاتی ہے کہ قافلے کے لوگ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، آواز کے رخ پر پلٹ کر دیکھتے ہیں، آواز کو سننے اور اس کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر یہ ہوتا ہے کہ شعوری ایمان اور زندہ جذبہ و احساس کے ساتھ منزل کا تعین اور راستے کی شناخت کرتے ہوئے ایک نیا قافلہ حرکت میں آجاتا ہے۔ جس کے ساتھ ساری تاریخ حرکت میں آجاتی ہے۔ نظریات اور علوم اور زبان و ادب حرکت میں آجاتے ہیں اور ایک نئی دنیا کے سرو سامان ہونے لگتے ہیں جیسے کہ اقبال نے کہا کہ ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن

ایسی ہی انقلاب انگیز شخصیت تھی مولانا مودودیؒ کی کہ جن کی آواز پر اٹھنے والا قافلہ موج در موج بڑھ رہا ہے۔

ان کے پیغام کا نیا پہلو یہ تھا کہ دین و سیاست میں تفریق نہیں کی جا سکتی، یعنی جس طرح فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک خاص اعتقادی اور اخلاقی سانچے میں ڈھلے، اسی طرح معاشرے یا قوم کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اپنی اجتماعیت کو اسلامی اعتقادات اور ضابطوں کے مطابق نشو و نما دے۔ نیز اجتماعیت کو چلانے کے لیے ایسی قیادت کو اپنے اندر سے ابھارے جو اسلام کو جاننے والی، ماننے والی اور اسے نافذ کرنے کی صلاحیت رکھنے والی ہو۔ پھر ان کی سوچ یوں بھی

نہ تھی کہ دین اور سیاست دو الگ الگ مفردات ہیں جنہیں ایک نسخے میں ملانا ہے اور جب جس جزء کو ضروری ہو بڑھایا یا گھٹایا جاسکتا ہے اور نئے نسخے تیار کیے جاسکتے ہیں۔ وہ وحدتِ دین وسیاست کے قائل تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ سیاست ہو یا معیشت و معاشرت سب کو اسلامی ایمان واعتقاد اور عبادات واخلاق کے ساتھ منضم شدہ تسلیم کرتے تھے۔ ضروریاتِ اخلاق و مدنیات میں سے جو چیز دین میں شامل اور اس کے مطابق نہ ہو وہ غیر اسلامی اور جو چیز اس میں شامل ہو اور اس کے مطابق ہو وہ عین اسلام! — یہاں مشکل یہ ہے کہ ہمارا یہ معاشرہ جو تفریقِ دین و دنیا کی گود میں پلا ہے۔ اور ہم جو اس معاشرے کی گود میں پلے ہیں۔ دین کے دو حصے الگ الگ کر کے ان کو ملانے کا تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور دینی نہیں ہے

اس پیغام کو جب مغربی نظریات — سیکولر سرمایہ داری اور کمیونزم — کے مقابل میں رکھ کر دیکھا جاتا تو فرماتے کہ جدید ملحدانہ افکار و تمدن کے سیلاب کے خلاف آپ کو ایک نیا سیلاب بن کر مقابلہ کرنا ہے جو غیر اسلامی سیلاب کا رُخ پھیر دے۔ ورنہ وقت کے سیلابِ بلا میں تیرنے یا اس کی موجوں پر بہنے یا اس کے سامنے چٹانوں کی طرح کھڑے ہونے سے بلکہ اس میں اپنی کشتیاں ترانے سے اور ان میں بیٹھ کر منہ کسی اُلٹی طرف کر لینے سے بھی اصل مصیبت سے نجات نہ ہو گی۔

سوجھ بوجھ کے ساتھ اسلام کا نام لینا ایک نئی دُنیا بنانے کا اعلان ہے۔ اس نئی دُنیا کے لیے مسلم ذہن و کردار کے معمار اور مزدور چاہئیں، ان کی اجتماعیت درکار ہے، ان میں فرد فرد تک دعوت پہنچانے اور اسے اپنے نصب العین کا سپاہی بنانے کی استعداد ہو۔ علاقے علاقے میں اس صلاحیت کے لوگ عوام کے لیے مرکزِ توجہ اور مرکزِ رابطہ بن کر بیٹھ جائیں۔ اور ان کو اپنے ساتھ جمع کر کے اسلام دشمن عالمی نظریات کے خلاف جہاد کرنے کی تیاری کریں۔ یہ دراصل نئے دَور کی نئی قسم کی تحریکِ جہاد ہے۔

انھوں نے تحریک کے لیے کارکنوں کی ایسی ٹیم تیار کی کہ وہ لوگ جس بات کو زبان پر لاتے اس کا پورا استدلال ان کے ساتھ ہوتا۔ بسا اوقات معمولی دیہاتی نوجوان اچھے اچھے تعلیم یافتہ اصحاب کو مادہ پرستی، جدید نظریات اور اسلامی نظام کے متعلق متاثر

کر لیتا۔

آج کا کارکن باتیں تو بہت سی کہتا ہے، مگر وہ ان کے ساتھ استدلال پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس نے اس طرح مطالعہ نہیں کیا ہے جیسے شروع میں مولانا مودودیؒ نے ہر کارکن سے چاہا تھا۔ کاش کہ اس پہلو سے آج کی عددی پھیلاؤ رکھنے والی تحریک ایسی کمزوری کو نشو و نما نہ پانے دے۔

مولانا مودودیؒ نے اسلامی نظامِ حیات کے ایک ایک اہم گوشے کا تفصیلی خاکہ کتاب و سنت سے اخذ کر کے دکھا دیا کہ کس طرح جدید دَور کے تمام مسائل کو بہترین اسلوب میں حل کرنے کا اہتمام موجود ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اسلام کو محض سلوگن سمجھ کر کام نہ کیا جائے اور لوگوں سے ایک ایسی چیز کا گول مول وعدہ نہ کیا جائے جس کی تشکیل و تکمیل کا وقت آئے تو سرے سے کوئی خاکہ ہی موجود نہ ہو۔

مولانا مودودیؒ کے متعلق ایک بات بہت اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ وہ محض سیاسی کھیل تماشے کے آدمی نہ تھے، بلکہ رُوحانی پہلو سے ان کا خاص مقام تھا۔ اس کا علم دو صورتوں میں خاص خاص لوگوں کو ہو سکا۔ ایک یہ کہ مصیبت زدہ اور ضرورتمند انسانوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے خاص اوقاتِ تنہائی میں وہ ذکر و دُعا اور مطالعۂ قرآن و حدیث میں مصروف رہتے۔ ان کی رُوحانی تجلیات کا عکس سچے اہلِ ذوق ان کی بعض تحریروں میں پا سکتے ہیں۔ صرف ان کی دُعائیں (جو کبھی کبھی اشارات میں آئیں) پڑھ لینے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس شخص کے تعلقات "اُدھر" کیسے تھے!

چند دوستوں نے ایک بار مل کر ایک جامع کتاب بڑی محنت سے تیار کی جس کا نام تھا "تزکیۂ نفس" اور اس میں مولانا مودودیؒ ہی کے اشارات تھے، باعبارات۔ کس محنت سے ہم نے یہ کام مولانا کی نگرانی میں کیا اور مولانا نے خود رہنمائی بھی دی اور اس کوشش کو پسند بھی کیا۔ کچھ نہ پوچھیے کہ کس طرح یہ مسودہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا اور دست بدست

ہوتا ہوا کہاں پہنچا ___ پھر کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ایسی کوئی چیز تھی بھی یا نہیں[1]
یہ روحانی قوت ہی تھی جس کے بل پر کبھی وہ ایسی باتیں ہم سے کیا کرتے تھے کہ یہ لوگ (حکومت)، میرے ساتھ اس طرح کی حرکتیں نہیں کر سکتے۔ ایسی روحانیت کے جلوے آپ پھانسی کی کوٹھڑی (۵۳ء) میں دیکھتے ہیں۔ اور اسی کی مار ہے جس کا نشانہ ہر وہ ظالم بنا جس نے مولانا کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔ زیادتی کرنے والا بہت برے حالات کا شکار ہوا۔

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

جب کبھی کوئی خاص تحریک چل رہی ہوتی، کوئی ملک گیر سرگرمی کسی بھی جانب سے موجود ہوتی، کبھی رویتِ ہلال وغیرہ کی اختلافی صورت زیرِ بحث ہوتی تو مولانا خود دفتر یا برآمدے یا لان میں دن یا رات کو بیٹھ جاتے اور اہلِ دفتر میں سے جو بھی موجود ہوتا اُسے کہتے کہ کراچی، فیصل آباد، راولپنڈی، ملتان، پشاور ___ وغیرہ ___ فون کر کے پوچھو کہ معاملہ کیا رہا۔ پھر یہ سلسلہ جگہ جگہ چلتا، یہاں تک کہ مولانا کے پاس اتنی جامع معلومات ہوتیں کہ نہ صرف وہ مختلف دریافت کنندگان کو بتاتے بلکہ ان معلومات کی بنیاد پر جب کوئی بیان مرتب کرتے تو وہ بہت مؤثر ہوتا۔ جب کبھی انتخابات ہوتے تب بھی ایسا ہوتا۔
مجھے ایسے کئی مواقع یاد ہیں۔ خصوصاً ایک وہ تھا جب ایوب خاں کے دور میں جماعتوں پر سے پابندی ختم کی گئی تو مولانا نے باہر کی تمام جماعتوں کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اجازت کے آغاز سے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر دفتر اور جملہ نظام کو فوراً بحال کر دیں۔ پھر اس کے

[1] پرانی داستان ہے کہ کنوئیں میں مقید شہزادے سے اسمِ اعظم جن لے اُڑے اور دست بدست وہ آگے پہنچ گیا ___ وہی ہمارے ساتھ ہوا۔ شہزادے نے تو ایک جن کو بیل کی شکل میں پکڑ لیا تھا، ہمیں تو نہ کوئی جن ملا، نہ آدمی، نہ بیل!

متعلق ہر جگہ سے مولانا نے معلومات لیں کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آن کا بیان آگیا کہ ہم نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام ملک میں اپنا جماعتی وجود اور نظام بحال کر دیا ہے۔"

مولانا کے لیے یہ ایک عطیہ خداوندی تھا کہ جب کبھی کوئی بیان دیتے تو ایک طرف حکومت یا کسی مخالف قوت کو ضروری جواب مل جاتا (یا اس پر تنقید ہو جاتی)، اور دوسری طرف کارکنوں کے چہرے تمتما اٹھتے، جیسے کہ کوئی گمشدہ متاع مل گئی ہو۔ دراصل کارکن جن اشکالات میں اُلجھے ہوئے ہوتے اور جن بحثوں سے گزرے ہوتے اور ایک طرف مخالفین کی طرف سے طعن و تشنیع کا سلسلہ ہوتا اور دوسری طرف اپنوں کا داخلی اضطراب۔ بس اس بھڑکتی آگ پہ پانی پڑ جاتا۔

یہ کوئی پیری کی کرامت یا سیاسی ہپناٹزم نہیں تھا، بلکہ مولانا مودودیؒ جب کبھی کسی مسئلے پہ برسرِعام اظہار رائے کرتے تو ایک تو تخلیقی ذہن سے ندرت کی راہ نکالتے دوسرے بات ایسے گٹھے ہوئے انداز سے کرتے اور ایسی پکی زمینِ استدلال پہ پاؤں رکھ کے کھڑے ہوتے کہ بالکل اسی طرح کارکن یہ محسوس کرتا کہ اب وہ بھی اپنے بیگانوں کے سامنے دوٹوک بات کر سکتا ہے، استدلال کی مضبوط سطح پہ کھڑا ہے۔ اور وہ اپنا سر بلند رکھ کر آگے چل سکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ اپنے بیانوں میں طرح طرح کے متفرق شاخسانے پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ "کچھ یوں بھی" اور "کچھ یوں بھی" والی بات ہوتی تو لوگوں کو کبھی اطمینان نہ ہوتا۔ یا محض بطور امکان سوچیے کہ پالیسیوں کی حالت جب بھی یہ ہو کہ کبھی وہ تیز بخار کی نبض کی طرح ہوں اور کبھی قلتِ ضغطِ دموی کی طرح سے مریل، اور ایسی کئی کئی کیفیتیں پالیسی کی ایک قرارداد یا ایک بیان میں پائی جائیں تو کارکن کا شعور توڑانواں ڈول ہی رہے گا۔

مثلاً یاد کیجیے، دورِ ایوبی کے اس اعلان کو ہی کہ اگر کنونشن لیگ کسی فرشتے کو بھی کھڑا کرے گی تو ہم اُسے ووٹ نہیں دیں گے۔ اس ذرا سے قول پہ حکومت کے نتھنوں سے جھڑتی چنگاریوں سے جیب و دامن کو جلوا لیا، مگر کسی مرحلے پہ بھی اعترافِ گناہ اور

اس پر اظہارِ ندامت کی لپستی نمودار نہ ہوئی - اور اس چیز نے کارکنوں کے دماغ بھی بلند کر دیئے۔

یہ بات مولانا نے یونہی لیڈری کی ترنگ میں نہیں کہہ دی تھی - وہ اپنی جماعت کے قریبی حلقوں اور عوامی دائروں میں ایوب صاحب اور کنونشن لیگ کے متعلق پائے جانے والے ایسے اثرات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جن کے ہوتے ہوئے تحریکی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ اہلِ جماعت کی مکروہ و مغضوب چیز کی طرف نہ جایا جائے - ورنہ کارکن بظاہر دوسری طرح کے حکم کو بھی سر آنکھوں پر لگائے پھر سکتا ہے - مگر ساتھ ہی اس کا سر بھی جھکا رہا ہوتا ہے اور آنکھیں بھی نمناک ہو رہی ہوتی ہیں۔[۱]

اپنے سے بعد والے ادوار کے لیے میں کہتا ہوں کہ خود بیانات کا رنگِ تسلسل بھی دیکھنے کا ہوتا ہے - آج بات آسمان کی، کل زمین کی، آج رُخ مشرق کا، کل مغرب کا - آج پوری گرماگرمی، کل حد سے زیادہ نرمی - ایک دن بڑی مضبوط اصول پسندی، دوسرے دن سازِ مصلحت کا راگ - ایک دن دینی اسپرٹ سے باتیں - دوسرے دن تمام تر سیاسی اندازِ تکلم - اگر تمام بیانات میں ایک مشترک مرکزی رُوح موجود نہ رہے، دین ہمیشہ جلوہ گر نہ رہے،

---

[۱] شخصی اور خاندانی اور قومی غیرت تو معروفِ عام ہے - ایک غیرت تحریک اسلامی کی غیرت بھی ہوتی ہے - مولانا نے ایک بار تحریکی غیرت کی بنا پر جس کسی کو نظرانداز کیا - پھر اسے کبھی اپنائیت کے دائرے میں نہیں لیا - اور کبھی اس سے دین یا تحریک یا جماعت یا اپنی ذات کے لیے کسی طرح کی خدمت نہیں لی - مجھے ایک زمانے میں کمیونسٹ اجلاسوں میں جمہوریت کے لیے تعاون کرنے کو کھینچتے رہے - پھر میں نے ایک بار کی جب تفصیلی رپورٹ دی کہ کس طرح دس پندرہ مصنوعی تنظیموں کے نمائندوں کے ووٹوں کے ذریعے ہمیں امیر سے سامنے کوئی اور صاحب بھی تھے) نہایت درست بات پر ناکام کر دیا تو مولانا نے ان سے سارا رابطہ ختم کر دیا اور پھر کبھی قائم نہیں کیا - معلوم نہیں کہ آج ان کی پیپلز پارٹی کے متعلق کیا رائے ہوتی۔

اُصول ہمیشہ برتر نہ رہیں تو روز روز کی اَدلا بدلی ارکان اور کارکنوں کے ذہنوں کو سخت پراگندہ، مضطرب اور معترض بنا دیتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ آئندہ کی لیڈر شپ مولانا کے بیانات اور پالیسی کے فیصلوں اور قرار دادوں کو نکال کر ایک ایک لفظ کو بغور پڑھے اور اپنے لیے نتائج و اسباق اخذ کرے۔

مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کو بغور پڑھیں یا اُن کے عملی نقشۂ ہائے کار کو دیکھیں، یہ بات بہت صاف ہو کر سامنے آتی ہے کہ اصلاح و انقلاب کا سارا دارومدار مولانا کے نزدیک بنیادی اسلامی دعوت کے فروغ پر تھا۔ اور اس اہم کام کے لیے وہ ہر مرحلے میں اور ہر مہم کے دوران یہ چاہتے تھے کہ کارکن لوگوں سے بالمشافہ رابطے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ عام گفتگو بھی کریں، اعتراضات کو سُنیں، جواباً دلائل دیں، جہاں ضرورت ہو لٹریچر بھی پیش کریں۔ ایک گفتگو کے بعد اس سلسلے کو آگے جاری رکھیں۔ متاثر ہو جانے والوں کے ذریعے ان کے حلقے کے نئے لوگوں سے تعلقات شروع کریں۔ ساتھ کے ساتھ لوگوں سے محبت بھی کریں۔ غریبوں کو سہارا دیں، علاج معالجے، تعلیم اور دوسرے پریشان کن مسائل میں اُن کی مدد کریں۔ شعبۂ خدمتِ خلق کام کر رہا ہو تو وہ اپنی جگہ کرتا رہے، مردوں اور خواتین کے حلقہ ہائے درس قائم ہوں وہ بھی فیض پھیلاتے رہیں۔ کوئی اخبار، رسالہ شائع ہو کر پھیلتا ہو تو وہ بھی اثر ڈالتا رہے، مزدوروں، طلبہ اور محلہ دار تنظیموں اور مصالحتی عدالتوں کے ذریعے اسلام کی روشنی کو جتنا عام کیا جا سکتا ہو، عام کیا جائے۔ جلسے اور مظاہرے ہوں تو گو وہ مزید برآں ایک طرح کی کوشش ہیں۔

اصل کام بنیادی دعوت کا ہے جو رابطۂ عام کے ذریعے ہونا چاہیے۔

اساسی نظریے کے بعد طریق کار کے تمام اجزا میں سے اہم ترین جزو یہی بنیادی دعوت کا جزو ہے، جسے مولانا نے اپنے فکری اور تحریکی ترکے میں ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

یہ کام کما حقہٗ نہ ہو تو نہ انقلاب کامیاب ہو سکتا ہے، نہ انتخاب، اس اصل کام

میں اگر کمی رہے تو آپ نہ تو قوت کے مصنوعی مظاہروں سے اسے پورا کر سکتے ہیں، نہ بیانوں اور انٹرویوز کے ذریعے اور نہ کمزور اساس کے وقتی محاذوں اور اتحادوں کے ذریعے۔

خدا تعالیٰ ہمیں مولانا مودودیؒ کی ساری تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کی عمومی توفیق کے ساتھ اساسی دعوت کے تقاضے کو ان کے منشا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق دے۔ اور ان کا منشا اس بارے میں وہی ہے جو کتاب و سنت کا ہے۔

یہی اساسی دعوت اور رابطِ عام کا سلسلہ اپنے اخلاق و کردار کی تعمیر اور اس کی حفاظت میں مدد دیتا ہے۔ اسلامی تحریک کی ساری نتیجہ خیزی اخلاقی علو پر مبنی ہے، جن لوگوں کی اخلاقی ساکھ گر جائے، پھر وہ اسلامی انقلاب تو کیا لائیں گے، اندیشہ ہے کہ کسی حادثے کا جھاڑو انہیں تاریخ کے آنگن سے کوڑے کی طرح باہر نہ اٹھا پھینکے۔

مولانا کی بات یاد ہو گی کہ اس ٹکسال کے سکوں پر محض اشرفی کی مہر لگی ہونا کافی نہیں، بلکہ دھات بھی خالص سونا ہونی چاہیے۔

کیا ہمارے کرداروں کے سکوں کی دھات خالص سونا ہے؟ اگر اس میں کچھ کھوٹ میل شامل ہو گیا تو بھٹیاں اور کٹھالیاں اور کسوٹیاں موجود ہیں، اپنی اپنی صفائی اور اپنے اپنے خالص پن کی فکر کیجیے۔

وہ شخص کیا کام کرنا چاہتا تھا؟

وہ کیسے کردار کے لوگ اپنے گرد جمع کرنا چاہتا تھا؟

وہ کس طرح کی تبدیلی چاہتا تھا؟

وہ جماعت کو کتنا باوقار رکھنا چاہتا تھا؟

وہ محض سیاسی تگ و تاز چاہتا تھا یا سیاست برائے انقلاب کا علمبردار تھا؟
وہ اساسی دعوت اور بنیادی رابطوں اور اخلاقی پاکیزگی کو کتنا اہم قرار دیتا تھا؟
یہ سارے سوال اب ایسے ہیں کہ جس کی جو مرضی ہو، ویسا ہی ان کے جواب دیتا ہے اور مولانا مودودی کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیتا ہے۔

مولانا کا وسیع لٹریچر ہر موضوع پر موجود ہے، مگر اسے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ اس میں سے جب ضرورت ہو، کسی مسئلے پر کچھ اقتباسات اپنی ضرورت کے ہم لوگ نکال لیتے ہیں۔ اور مجموعی مدعا کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ وہ تو ہم جانتے ہیں۔

اگر ہم لوگوں میں تساہل و تغافل پیدا ہو جائے تو اس سے آگے ایسا دور بھی آ سکتا ہے کہ مولانا کے پیغام اور لٹریچر اور تحریروں کی ایسی تاویلیں کی جانے لگیں کہ اُلٹ نتیجے نکلیں اور لوگ کہیں کہ زمانے کے حالات اور وقت کی ضرورتوں کے تحت یہی عمل صحیح ہے۔

ہم سب کی خواہش ہونی چاہیے کہ مولانا مودودی نے جو لکیر ۱۹۴۱ء سے کھینچ کر ۱۹۷۹ء تک پہنچائی تھی۔ اس مستقیم لکیر کو آگے بڑھایا جاتا رہے اور پیچ و خم پیدا کر کے اس لکیر کو منحنی لکیر نہ بنا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ مولانا سید ابوالاعلیٰ کی قبر مبارک کو نور سے بھر دے اور ان کی رُوح پر رحمتوں کی شعاعیں برسائے۔ جنھوں نے ہمیں دینِ پاک کا ایسا صحیح شعور دیا کہ ہم تحریکِ اسلامی کے علمبردار بن سکیں۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

"چاہے یہ کام آپ کو ۵۰ سال بھی کرنا پڑے"!

جماعتِ اسلامی کا سالانہ اجتماع مدت بعد مارچ ۱۹۷۴ء میں منعقد ہوا۔ اپنی نوعیت کا یہ آخری اجتماع تھا، جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مؤسسِ جماعت کی زندگی میں منعقد ہوا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء کو اس اجتماع سے مؤسسِ جماعت نے گویا آخری باتیں کیں۔ یہ ایسے کلمات ہیں کہ ان کو سینوں کے اندر تعویذ بنا کر لٹکا لینا چاہیے۔ (رشحہ رص)

اب میں آپ سے جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی جس غرض کے لیے قائم ہوئی ہے وہ ایک اور صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے دین کو پوری طرح سے، پوری زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اس کے سوا اس جماعت کا اور کوئی مقصد اور نصب العین نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس جماعت سے وابستہ ہے، خواہ وہ رکن کی حیثیت سے وابستہ ہو یا کارکن اور متفق کی حیثیت سے، وابستہ ہو، اُسے یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جماعتِ اسلامی کا اصل مقصد دینِ حق کو مکمل طور پر خدا کی زمین پر غالب کرنا ہے۔ اگر ہم سیاسی کام بھی کرتے ہیں تو اقتدار حاصل کرنے یا دوسری سیاسی اغراض کے لیے نہیں کرتے، بلکہ اس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو دینِ حق کے قیام میں مانع ہو رہی ہیں اور جمہوری ذرائع سے ملک کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کا راستہ ہموار ہو سکے۔ جماعتِ اسلامی نے یہ جو مسلک اختیار کیا ہے کہ وہ کسی قسم کے تشدد اور توڑ پھوڑ کے ذریعے سے کسی قسم کی

دہشت پسندانہ تحریک کے ذریعے سے اور کسی قسم کی خفیہ تحریک یا سازشوں کے ذریعے سے ملک میں انقلاب برپا نہیں کرنا چاہتی، بلکہ خالصتاً جمہوری ذرائع سے انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے، یہ مسلک قطعاً کسی کے خوف کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ ہرگز اس بناء پر نہیں ہے کہ ہم کبھی کسی ابتلا کے وقت اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ ہم دہشت پسند نہیں ہیں، ہمارے اوپر تشدد یا قانون شکنی کا الزام نہ لگایا جائے۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر اسلامی انقلاب ہے اور اسلامی انقلاب کسی خطۂ زمین میں اس وقت تک مضبوط جڑوں سے قائم نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہاں کے رہنے والے لوگوں کے خیالات تبدیل نہ کر دیئے جائیں، جب تک لوگوں کے افکار اور ان کے اخلاق وعادات میں تبدیلی نہ لائی جائے اس وقت تک مضبوط بنیادوں پر کوئی انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔ اگر زبردستی کسی قسم کے تشدد کے ذریعے سے، یا سازشوں اور خفیہ ہتھکنڈوں کے ذریعے سے کوئی انقلاب برپا کر دیا جائے تو اس کو کبھی دوام اور ثبات نصیب نہیں ہوتا اور بالآخر اسے کسی دوسرے انقلاب کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اگر دھوکے بازیوں اور جھوٹ اور افتراء کی مہم کے ساتھ انتخابات جیت کر، یا کسی اور طریقے سے حکومت پر قبضہ کر کے کوئی سیاسی انقلاب برپا کر بھی دیا جائے تو چاہے وہ کتنی دیر تک قائم رہے لیکن جب وہ اکھڑتا ہے تو اس طرح اکھڑتا ہے جیسے اس کی کوئی جڑ ہی نہیں تھی۔

ہم اس طرح کے تجربے نہیں کرنا چاہتے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ چاہے کتنا ہی عرصہ لگ جائے لیکن پہلے قوم کے ذہن کو تبدیل کیا جائے اور اس کو اس حد تک تیار کیا جائے کہ وہ اسلامی نظام کا بوجھ سہار سکے۔ اسلامی نظام کو چلانے کے قابل ہو سکے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے تیس برس اپنا زور لگایا مگر کیا کر لیا۔ میں کہتا ہوں کہ ہماری تیس سالہ شبانہ روز محنت کا ثمر یہ ہے کہ اس وقت خدا کے فضل سے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت ہماری ہم خیال ہے۔ ملک کے اہلِ دماغ طبقہ کے اندر اسلامی افکار اپنا مقام بنا چکے ہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں، جہاں جہاں بھی تعلیم یافتہ اور صاحبِ فکر لوگ موجود ہیں ان کی

اکثر بہت متاثر اور ان افکار کی قائل ہو چکی ہے۔

اب دوسرا کام جو ہمارے سامنے ہے اور فی الحقیقت بہت بڑا کام ہے وہ عام لوگوں کے خیالات کو تبدیل کرنا اور ان کے اندر اسلامی فکر اور اسلامی نظام کے بنیادی تصورات کو راسخ کرنا ہے ان کے اندر اخلاقی انقلاب برپا کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بڑا مشکل کام ہے لیکن یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے۔ یہ کام پہلے بھی ہمارے پروگرام میں شامل رہا ہے اور ہم اس سے کبھی غافل نہ تھے۔ ہم اگر اس میدان میں اب تک بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکے تو اس کے کچھ اسباب و موانع بھی ہیں جن سے صرفِ نظر نہ کرنا چاہیئے۔

یہ امر واقع ہے کہ پچھلے چھبیس ستائیس سال کے دوران میں جن لوگوں کے ہاتھ میں بھی اس ملک کا نظام چلانے کے اختیارات رہے ہیں خواہ وہ سیاسی اختیارات ہوں یا معاشی یا تعلیمی اختیارات ہوں (ایک آدھ کو چھوڑ کر) انھوں نے اس قوم کے ذہن کو بگاڑنے اور اس کے سیرت و کردار کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور اس کو اسلام سے دور سے دور تر کر دیا۔ یہ انھی کی اس مجرمانہ روش اور بد اندیشیوں کا نتیجہ ہے کہ آخرکار مشرقی پاکستان، پاکستان سے الگ ہوا۔ وہاں مسلسل یہ ذہن پیدا کیا گیا کہ بنگالی بولنے والے مسلمان اور ہندو ایک قوم ہیں اور بنگالی نہ بولنے والے دوسری قوم۔ یہ ذہن وہاں پیدا کیا جاتا رہا ہے لیکن حکومت کی طرف سے کبھی اس کی روک تھام نہ کی گئی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی ہی کی گئی۔

یہاں برسرِ اقتدار آنے والے لوگ ہمیشہ خاموش تماشائی بنے رہے اور اس کے نتیجے میں آخرکار مشرقی پاکستان الگ ہو کر رہا۔ اور اب یہاں بھی اسی کفر کے پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہاں لوگوں کے اندر یہ ذہن زبردستی پیدا کیا جا رہا ہے کہ یہاں کوئی پٹھان ہے اور کوئی بلوچی، کوئی سندھی اور کوئی پنجابی۔ کیا یہ پاکستان کی بنیاد تھی؟ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں تو سارے ہندوستان کے مسلمان یہ بھول گئے تھے کہ ہم کون ہیں ان کے پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ ہم اوّل و آخر مسلمان ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب

انہوں نے مل کر کوشش کی اور متحد ہو کر پاکستان کا مطالبہ کیا تب پاکستان وجود میں آیا ورنہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اگر گجراتی اور مدراسی اور ملیباری اور سندھی اور پٹھان اور پنجابی سب کے سب الگ الگ قومیتوں کا تصور رکھتے تو پاکستان کبھی بن سکتا اور اب یہاں پھر الگ الگ قومیتوں کا جو تصور پھیلایا جا رہا ہے یہ لازماً پاکستان کے ٹکڑے اڑانے والا ہے سندھ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ بعینہٖ مشرقی پاکستان کی سی صورتحال پیدا کی جا رہی ہے۔ سندھ کا عام مسلمان نہایت سیدھا سادھا مخلص مسلمان ہے لیکن وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے میں یہ خالص کافرانہ تصور پھیلایا جا رہا ہے کہ سندھی بولنے والا ہندو اور مسلمان ایک قوم ہے اور جو سندھی نہیں بولتا، وہ چاہے مسلمان ہو، وہ دوسری قوم ہے۔ اسی طرح کی کوششیں دوسرے صوبوں میں بھی جاری ہیں۔

اس طرح ایک طرف تو لوگوں کے نظریات کو بگاڑنے اور ان کے اندر افتراق وانتشار کے بیج بونے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دوسری طرف ان کے اخلاق کو بگاڑنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے جا رہے ہیں۔ تیسری طرف تعلیم کا ایسا نظام رائج کیا جا رہا ہے جس سے ایک نوجوان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اسے اسلامی نظام چلانے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے یا سوشلسٹ نظام چلانے کی تربیت دی جا رہی ہے یا سرے سے اسے کوئی نظام بنانے اور چلانے کے لئے تیار بھی کیا جا رہا ہے یا نہیں؟ اس طرح کی ایک بگڑی ہوئی صورتحال آپ کے گردوپیش میں پیدا کی جا رہی ہے۔

اس حالت میں آپ کو جان مار کر کوشش کرنی ہے۔ اس غرض کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کرنی ہے کہ عام لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ اسلامی ذہن پیدا کریں، کیونکہ **جب تک آپ یہ کام نہیں کریں گے اس وقت تک یہاں اسلامی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔**

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہاں جمہوریت کو کبھی چلنے نہیں دیا گیا اور جمہوری طریقوں سے صالح تغیر کا راستہ قریب قریب بند کر دیا گیا ہے اور اگر یہاں کبھی انتخابات ہوئے بھی ہیں تو وہ انتہائی بے ایمانیوں اور بددیانتیوں کے ذریعے سے

جیتے جاتے رہے ہیں اور ایسے حالات بھی یہاں پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ اگر مفروضے کے طور پر ہم انتخابات میں کبھی سو فیصد ووٹ حاصل کر بھی لیں تو صندوقچیوں سے سو فیصد ووٹ ہمارے خلاف ہی برآمد ہوں گے تو ایسی صورت میں جمہوری ذرائع سے اصلاحِ احوال کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ یہ صورتحال فی الواقع یہاں موجود ہے لیکن ہمیں اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہمیں اس صورتحال کو بدلنے کے لئے پوری پوری جدوجہد کرنی ہے۔ ہمیں اس غرض کے لئے سرتوڑ کوشش کرنی ہے کہ ہماری انتھک محنتوں کے نتیجے میں انسانوں کا سیلاب اس طرح انتخابات کے مراکز پر امڈ آئے کہ اگر کوئی شخص بے ایمانیاں کرنا بھی چاہے تو نہ کرسکے انقلابی تحریکوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب لوگوں کے اندر ان کے پھیلائے ہوئے خیالات اس قدر مضبوطی سے جم جاتے ہیں اور ان کے اندر ایک ایسا عزمِ راسخ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد پھر کوئی طاقت ان کے مطلوبہ نظام کو آنے سے نہیں روک سکتی۔ وہ ہر راستے سے آتا ہے اور ایسے راستوں سے آتا ہے جن کو بند کرنے کا خیال بھی کسی کے دماغ میں نہیں آسکتا۔ اس لئے آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ آپ جس نظام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ یہاں کیسے آئے گا؟ آپ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا فرض نہایت خلوص اور جانفشانی کے ساتھ ادا کرتے چلے جائیں اور آپ کی واحد فکر آپ کا وہ کام ہو جسے آپ کو انجام دینا ہے۔

یہ کام آپ صرف اسی صورت میں انجام دے سکتے ہیں جبکہ آپ کے اپنے اخلاق اس سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں جو اس نظام کا تقاضا ہے جب آپ اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے اٹھیں گے تو یہ لوگ دیکھیں گے کہ ہمیں یہ دعوت دینے والے خود کیسے ہیں۔ اگر آپ کے اخلاق اور سیرت و کردار میں کوئی خرابی ہوئی یا آپ کے اندر ایسے لوگ پائے گئے جو مناصب کے خواہشمند اور ان کے لئے حریص ہوں یا آپ کے اندر ایسے لوگ موجود ہوئے جو کسی درجہ میں بھی نظم کی خلاف ورزی کرنے والے ہوں تو اس صورت میں آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ اس لئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین

کر لیجئے کہ اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کرنے کے مخصوص تقاضے ہیں۔ اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے وقت آپ کو جن چیزوں کو خاص طور پہ پیش نظر رکھنا ہوگا وہ یہ ہیں کہ آپ کے اخلاق نہایت بلند ہوں۔ آپ کی زندگی پوری طرح اسلام کے ڈھانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ آپ کے اندر نظم جماعت کی کامل اطاعت پائی جاتی ہو۔ آپ جماعت کے دستور کی پوری طرح پابندی کرنے والے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ آپ عوام الناس کے اندر پھیل کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے ہر لحظہ کوشاں ہوں اور چاہے یہ کام آپ کو پچاس سال بھی کرنا پڑے لیکن آپ لگن کے ساتھ اسے کرتے چلے جانے کا مصمم ارادہ رکھتے ہوں تو انشاء اللہ کوئی طاقت اس ملک کو اسلامی ملک بننے سے نہیں روک سکے گی۔

(اخذ و اقتباس از محمد یوسف صاحب منصورہ)

قرآن کا تصوّرِ علم

ڈاکٹر سید مسعود احمد صاحب

(۲)

علم کی اہمیت علم کی اہمیت کا اندازہ اس تاریخی واقعہ کی روشنی میں آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ نبی آخر الزمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی ہی میں خالقِ کائنات نے اپنے تعارف کے ساتھ علم کی اہمیت بیان فرمائی اور اس کے ذرائع کا مختصر تعارف بھی کرایا۔ (العلق ۱ تا ۵) اور اس نبیٔ اُمی (الجمعہ : ۲) کو کلمۂ "اقرأ" کی خلعتِ نبوت سے نوازا گیا جس نے کسی مدرسہ میں یا کسی معلم سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ پانچ جملوں کی اس چھوٹی سی وحی میں دو بار پڑھنے (اقرأ) اور تین بار جاننے (علم) کا ذکر فرمایا۔ مزید برآں اس کتابِ ہدایت کا اسمِ ذاتی ہی "قرآن" (الانعام : ۱۹)[۱] یعنی پڑھی جانے والی چیز رکھا گیا۔ اور اس کتاب کو العلم (البقرہ : ۱۲۰)[۲] سے تعبیر کیا گیا۔ علم کی اہمیت اجاگر کرنے کی غرض سے اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے نام بھی قرآن کے لیے استعمال کیے گئے۔ مثلاً حکمت (بنی اسرائیل : ۳۹ - الاحزاب : ۳۴) ہدیٰ (البقرہ : ۲-۹۷، ۱۸۵)[۳]۔ برہان (النساء : ۱۷۴) کلام (التوبہ ۶، الفتح : ۱۵) ذکر

[۱] مزید دیکھیں یونس : ۳۷ ، یوسف : ۳ ، بنی اسرائیل : ۹

[۲] نیز ملاحظہ ہو آل عمران : ۶۱ - الرعد - ۳۷

[۳] مزید دیکھیں آل عمران : ۱۳۸ ، المائدہ : ۴۶ ، الانعام : ۱۵۷ ، القصص : ۴۳

وغیرہ (الحجر: ۹)[1]۔ ظاہر ہے کہ یہ علم ہی کی مختلف شاخیں ہیں۔ قرآن نے معلّمِ دوراں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیوں میں بعثت کا مقصد ہی یہ قرار دیا کہ وہ اُن کے درمیان اللہ کی آیات کی تلاوت کریں، علم وحکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں۔ (آل عمران: ۱۶۴)[2]

اسلام نے لوح (البروج: ۲۱، ۲۲) اور قلم (القلم: ۱) کا تصور دیا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور قوانین محفوظ کی جاتی ہیں۔ یہ تصور آپ کو دُنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملے گا۔ علاوہ بریں ام الکتاب (الزخرف: ۴)[3] اور کتاب مبین (یونس: ۶۱)[4] کی شکل میں زمین وآسمان کے جملہ علوم پر حاوی کتاب کا تصور بھی قرآن ہی کی دین ہے۔ اسی اسلامی تصور کو مستعار لے کر دُنیا میں انسائیکلوپیڈیا کا خیال پیدا ہوا۔ جسے اس اُم الکتاب سے نسبت قطرہ اور سمندر کی بھی شاید نہ ہو۔

آخر کوئی وجہ ہی تو تھی جس کی بنیاد پر اس علیم وبصیر ذات نے "قلم" اور جو کچھ لکھا جا رہا تھا اس کی قسم کھائی اور ایک صورت کا نام ہی قلم رکھوا دیا۔ (القلم) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک "علیم" فرزند کی بشارت دی گئی۔ (الذاریات ۲۸، الحجر: ۵۳) اس نعمتِ خداوندی کا اندازہ اس آیت پاک سے بھی لگایئے کہ جس میں نبی اکرم کو منعمِ حقیقی نے حکم دیا کہ آپ ہم سے علم میں اضافے کی دُعا مانگیے۔ (طٰہٰ: ۱۱۴)

قرآن کا علمی طرزِ استدلال تو ہر قاری پر روزِ روشن کی طرح ہر صفحہ قرآن سے عیاں ہو ہی جاتا ہے، جس کی تردید اس کے دشمن بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارا مقصد تو یہاں اس کے ذخیرۂ دلائل میں سے چند ایک کے ذریعے علم کی اہمیت بیان کر دینا ہے۔ غور فرمایئے کہ قرآن ایک جگہ بایں الفاظ اپنے استدلال کی بنیاد اُٹھاتا ہے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔ مزید

---

[1] مزید دیکھیں۔ النحل: ۴۴، الانبیاء: ۵۰، یوسف: ۱۰۴، الطلاق: ۱۰

[2] مزید دیکھیں: الجمعہ: ۲، البقرہ: ۱۰۱

[3] مزید دیکھیں: الرعد: ۳۹، فاطر: ۱۱

[4] مزید دیکھیں: ہود: ۶، الانعام: ۳۸، النحل: ۸۹

قرآن فرماتا ہے کہ تمہیں علم نہ ہو تو اہلِ علم سے پوچھ لو (الانبیاء: ۷، النحل: ۴۳) مشرکین کے لایعنی رسوم رواج اور بے سروپا عقائد کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ لوگ ظن و تخمین کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کے پاس ان غلط عقائد و اعمال کی کوئی علمی سندِ جواز نہیں۔ (النساء: ۱۵۷) ایک مقام پر اُن کے سامنے یہ چبھتا ہوا سوال بھی پیش کر دیا گیا کہ کیا یہ اپنے آباء و اجداد کی تقلید تب بھی کرتے رہیں گے جب کہ اُن کے بزرگ نہ کوئی علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں (المائدہ: ۱۰۴) پر زور علمی استدلال کی ایک ناقابلِ تردید دلیل بھی ملاحظہ ہو جس میں ارشاد فرمایا گیا کہ اگر تمہارے پاس کوئی علم ہو تو ہمارے سامنے لاؤ۔ (الانعام: ۱۴۸)

اجتماعی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ قیادت کا ہوتا ہے۔ قرآن قیادت کی اہلیت کے لیے علم کی بالاتری قائم رکھتا ہے۔ (البقرہ: ۲۴۷) معاشرتی معاملات میں اس کی ہدایت ہے کہ آپس میں لین دین قرض اور معاملات کو ضبطِ تحریر میں لے آؤ اور لکھنے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ لکھنے سے پہلو تہی نہ کیا کریں (البقرہ: ۲۸۲) علم کی فضیلت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ رب العلمین نے سرورِ کائنات کو یہ حکم دیا کہ آپ ان لوگوں کی خواہشات پر نہ چلیں جن کو علم نہیں (الجاثیہ: ۱۸) اور جاہلوں سے اعراض کریں (الاعراف: ۱۹۹) حضور اکرمؐ کے توسط سے عام لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کا پیچھا نہ کیا کرو، کیونکہ کان، آنکھ اور دل و دماغ کے سلسلہ میں ہر شخص سے پوچھ گچھ ہوگی۔ (بنی اسرائیل: ۳۶) اگرچہ علم حاصل کرنا تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا اہتمام کرنا ریاست کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس حکم پر عملدرآمد کی صورت ایسی تجویز کی گئی ہے کہ فروغِ علم کے اہتمام کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی دوسری سرگرمیاں بھی جاری رہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ سارے کے سارے بیک وقت تحصیلِ علم کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ اُن کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل آئیں اور دین کی سمجھ پیدا کرنے کے بعد واپس جا کر اپنے ہاں کے لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں تاکہ وہ اللہ کی نافرمانی سے بچا کریں۔ (التوبہ: ۱۲۲)

علم کی قوت علم کی قوت اس واقعہ سے بھی اُجاگر ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ایک طاقتور جن نے ملکۂ سبا کے تخت کو سینکڑوں میل سے ان کے دربار کی برخاستگی سے قبل لانے کی پیش کش کی تو ایک شخص نے، جسے علمِ کتاب سے نوازا گیا تھا اس جن کو چیلنج کر دیا اور کہا کہ میں اس تخت کو پلک جھپکنے سے قبل لا سکتا ہوں۔ اتنا کہتے ہی وہ تخت حضرت سلیمان کے سامنے تھا۔ (النمل: ۴۰) نزولِ قرآن کے وقت قرآن کا پیش کردہ یہ واقعہ بے شک ایک ناقابلِ تصور عجوبہ تھا۔ مگر آج انسان کے علم و عقل کے مظاہر راکٹ، ہوائی جہاز، بجلی، ریڈیو، ٹیلی وژن، ایٹمی اور نیوکلیر مشینوں وغیرہ کی موجودگی میں یہ واقعہ اب ناممکنات کی سرحدوں سے نکل کر ممکن الوقوع ہو گیا ہے بس فرق اتنا ہی ہے کہ ہمارے سائنس دان علمِ ظاہر سے تو بے شک بہرہ ور ہیں، مگر علمٌ من الکتاب (النمل: ۴۰، الرعد: ۴۳) کی ناپیدا کنار قوتِ تسخیر سے نابلد ہیں اس وجہ سے ایسے ناممکن الوقوع واقعات تک کو غیر سائنٹیفک کہہ کر رد کر دیتے ہیں انہیں تامل نہیں ہوتا۔ یہ خود ایک غیر سائنٹیفک انداز ہے جس سے علم کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

علم کی اقسام مختلف پہلوؤں سے علم کی متعدد اقسام ممکن ہیں۔ ہم یہاں چند نمایاں پہلوؤں کی روشنی میں بحث کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبلی اور شعوری (البقرہ: ۳۱)[۱] دونوں قسم کے علوم سے نوازا ہے جن کو وہبی اور کسبی علوم کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ وہبی علوم کے ذیل میں علمِ نبوت و معرفت، (مریم: ۳۰، ۵۱، ۵۴)[۲]۔ علم لدنی (الکہف - ۶۵) علم فجور و تقویٰ (الشمس: ۸) وغیرہ رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ علوم براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو پہنچتے ہیں۔ ان علوم میں انسانی کسب و ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ الہام و مکاشفہ اور رؤیا کو وہبی علوم میں رکھنا بحث طلب مسئلہ ہے۔ جوگیانہ مشقوں سے بھی اسی قسم کا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے لہٰذا اِن خوارقِ عادات میں انسانی کسب و ارادہ اور القاء شیطانی کا بہت امکان ہے۔ علمِ وحی، علمِ لدنی وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی حفاظت کا ذمہ ہے لہٰذا یہ شیطانی حربوں سے پاک ہیں۔ (الجن: ۲۶، ۲۸)

---

[۱] مزید دیکھیں العلق: ۴، ۵ - الشمس: ۸

[۲] مزید دیکھیں الاعراف: ۱۵۸ - الزخرف - ۶

علومِ کسبی حواسِ خمسہ کے ذریعے یا کچھ آلات کی مدد سے نیز دو انسانوں کے تعامل یا انسان و کائنات کے تعامل سے انسانی عقل و شعور اور محنت و مشقت کے مطابق ملتے ہیں۔ عقل و شعور سے یہاں ہماری مراد قوتِ استنباط ہے جو سراسر عطیۂ خداوندی ہے۔ اِن علوم کے قریبی مآخذ اور ذرائع آنکھ، کان، فواد (بنی اسرائیل: ۳۶، المومنون: ۷۸)، غور و فکر[1]، سیر و سیاحت مع الفکر (العنکبوت: ۲۰)[2] قصص و تاریخ سے عبرت پذیری (الاعراف: ۱۷۶) وغیرہ ہیں[3]۔

کسبی علوم کے دُنیا پر اثرات کی نسبت سے مزید تین قسمیں کی جا سکتی ہیں:

۱۔ علومِ خیر مثلاً قرآن و حدیث کا علم یعنی علومِ نبوت کو صاحبِ وحی سے بالواسطہ یا براہ راست حاصل کرنا۔ ان کو علومِ محمود بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان علوم کا حاصل کرنا فرضِ عین اور ان میں دسترس حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے۔

۲۔ علومِ فتنہ جن میں تمام دنیوی علوم آ جاتے ہیں۔ نیز علومِ خیر کو بدنیتی سے حاصل کرنا، یا ان کے معانی و مفاہیم میں افراط و تفریط سے کام لینا بھی فتنہ کا موجب بن جاتا ہے۔ گویا ہر علم موجبِ فتنہ اور ذریعہ آزمائش ہے۔ البتہ اس کے حاصل کرنے میں خیر و شر اس بات پر منحصر ہے کہ طالب علم اور صاحبِ علم اس کو کس نیت سے اور کس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

۳۔ علومِ شر مثلاً سحر، علمِ نجوم، علمِ قیافہ وغیرہ ان کو سیکھنا، سکھانا غلط ہے اور یہ علوم مذموم ہیں، کیونکہ یہ شیطان کے القاء کا نتیجہ ہیں اور اس کے حواریوں کے ذریعے فروغ پاتے ہیں نیز دنیا میں فساد کا باعث بنتے ہیں۔

علم کے حصول و استعمال کے لیے بنیادی ہدایتیں

اسلام نے ہمارے خیال میں علم کے لیے چار بنیادیں فراہم کی ہیں۔ توحید، رسالت، آخرت اور خلافت۔

علم کا توحیدی نظریہ یہ ہے کہ تمام علوم کا حقیقی سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے (العلق: ۴، ۵۔ الرحمٰن: ۲)

---

[1] حٰمٓ السجدہ: ۵۳، ۵۴۔ الذاریات: ۲۰ تا ۲۳۔ البقرہ: ۱۶۴۔ آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱۔ الاعراف: ۹۱

[2] مزید دیکھیں النحل: ۳۶۔ فاطر: ۴۴۔ الروم: ۹، ۴۲۔ مومن: ۲۱۔ الانعام: ۱۱

[3] مزید دیکھیں المائدہ: ۲۷ تا ۳۰۔ ہود: ۱۰۰۔ یوسف: ۳۔ ۱۱

اُسی نے تیر کل کے تحت ہی تمام علوم کو ظہور بخشا ہے۔ لہٰذا علوم کو حاصل کرنے کا مقصد صرف معرفتِ خداوندی اور خشیتِ الٰہی پیدا کرنا (فاطر: ۲۸)[1] اور انسانوں کی فلاح اور کائنات کے توازن و تعمیر کے لیے استعمال کرنا ہے۔ یہ استخراج وحدتِ الٰہ (البقرہ: ۱۶۳)[2] وحدتِ انسانیت (الحجرات: ۱۳)[3] اور وحدتِ علم (العلق: ۴، ۵)[4] اور وحدتِ کائنات (الملک: ۳)[5] پر مبنی ہے اور یہی قرآن کا جامع تصور ہے۔ بالفاظِ دیگر توحیدی نظریۂ علم کی رُو سے علم کا ابتدائی سرا اللہ کی ذات اور آخری سرا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے یعنی اس کی معرفت حاصل کرنا اور اس کی تخلیقات میں نظامِ خداوندی کو قائم رکھنا۔

رسالت کا عقیدہ علم کے سلسلہ میں یہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست علم دیا اور اس علمِ حقیقی و یقینی کو بذریعہ وحی بھیجا (الاعراف: ۳۵)[6]۔ رسول ہی سفرِ حیات میں سیدھے راستہ کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ (الاعراف: ۳۵)[7] علم نبوت ہی حق اور لاریب ہے (الاعراف: ۶۲، النمل: ۷۹) ۔ یہ عقیدہ تمام علومِ دنیوی اور علومِ اُخروی، علوم ظاہر اور علوم باطن، علومِ طبیعیات اور علومِ مابعد الطبیعیات وغیرہ کو علمِ وحی کے تابع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی رُو سے علمِ حقیقی براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے جب کہ انسان اپنی طرف سے تخمین و ظن اور ضد و تعصب کی بنیاد پر بہت سے فلسفے اور راستے متعین کر لیتا ہے (النمل: ۹) اور ان بے لگام کیسی علوم کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد کا موجب بنتا ہے۔ (الروم: ۴۱)

---

۱ نیز ملاحظہ ہو بنی اسرائیل: ۱۰۷ - الحج: ۵۴

۲ مزید ملاحظہ ہو النساء: ۱۷۱ - یوسف: ۳۹ - الرعد: ۱۶ - ابراہیم: ۴۸

۳ مزید دیکھیں البقرہ: ۲۱۳ - النساء: ۱

۴ مزید ملاحظہ ہو الرحمٰن: ۲

۵ مزید دیکھیں - الانعام: ۷۳ - الانبیاء: ۳۳

۶ مزید دیکھیے ہود: ۲۸ - النحل: ۲

۷ مزید دیکھیے ہود: ۲۸ - النحل: ۲

یہ رسولؐ ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسا علم محمود ہے اور کونسا مذموم، بلکہ رسولؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ حکمت و بصیرت کی باتیں سکھائے (آل عمران: ۱۶۴) اور حق و ناحق کے درمیان تمیز کردے، نیز بُرے اعمال کے بُرے انجام اور اعمالِ حسنہ کے بہترین نتائج سے انسانوں کو آگاہ کردے (الکہف: ۵۶)

رسالت کے ضمن میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین محمد رسول اللہؐ کے ذریعہ مکمل کر دیا ہے[1] اور شریعت محمدی کی یہ خصوصیت ہے کہ ہدایت کے باب میں یہی عالمگیر قانونِ حیات ہے اور نبی اکرمؐ ہی تمام عالم کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں[2]۔

آخرت کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے کسب کا خود ذمہ دار ہے (البقرہ: ۱۴۱)[3] اس کو اپنے علم و عمل کا ایک روز حساب دینا ہے۔ (الاعراف: ۶)[4] لہٰذا ہر علم کو اخروی فلاح کی نیت سے حاصل کرنا چاہیے۔ اور اس کا استعمال بھی اسی راہ میں ہونا چاہیے، جس میں فلاحِ آخرت کی ضمانت ملتی ہو۔ اسلام میں فلاحِ آخرت کی بنیاد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر رکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ علم کو معرفتِ خداوندی اور احکامِ خداوندی کی بجا آوری کے لیے حاصل کیا جائے اور اللہ کے بندوں کا یہ حق ہے کہ ہر علم کے حصول و استعمال کا مقصد تعمیرِ انسانیت، بہبودِ خلائق اور معاشرہ میں عدل و انصاف کا قیام ہو۔

منکرینِ آخرت اور مومنین میں علم کے پہلو سے ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ منکرینِ آخرت دنیوی کامیابی اور مفاد کے لیے علم حاصل کرتے ہیں اور وہ علم ظاہر یعنی علومِ مادی سے آگے نہیں بڑھتے جب کہ فلاحِ آخرت کے لیے علومِ غیب اور علومِ روحانی کی بھی ضرورت

[1] المائدۃ ـ ۳

[2] الاعراف: ۱۵۸ ـ الانبیاء: ۱۰۷ ـ

[3] مزید دیکھیں یونس: ۴۱ ـ القیامہ: ۳۶ ـ بنی اسرائیل ۱۵، ۳۶ ـ الاعراف: ۶

[4] مزید دیکھیے الانبیاء: ۴۷ ـ الزلزال: ۷، ۸ ـ البقرہ: ۲۸۴ ـ النجم: ۳۹، ۴۰

ہے۔

خلافت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے (البقرہ: ۳۰)[۱]۔ وہ امانتِ الٰہی کا حامل ہے (الاحزاب: ۷۲) اس کو خلافتِ ارضی کی گوناگوں ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ہی علم عطا ہوا ہے۔ (البقرہ: ۳۰، ۳۱) وہ اشرف المخلوقات ہے (ص: ۷۵)[۲] اور تسخیرِ کائنات کا اہل ہے (لقمان: ۲۰)[۳] اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کائناتی علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ (حم السجدہ: ۵۳ ـ العنکبوت: ۴۹) اسے علم و بصیرت، حکمت اور تفقہ جیسی صفات اسی لیے عطا کی گئی ہیں کہ وہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری و نافذ کرے۔ ارتقاءِ خودی اور کائنات و انسان کے درمیان بہترین ہم آہنگی کے اصولوں پر علوم کی بنیادیں قائم کرنا ہی خلیفہ ارضی کے شایانِ شان ہے۔

علم کے اسلامی اور غیر اسلامی تصور میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اسلام علم کے دونوں سرے (ENDS) اور اس کی سمت متعین کرتا ہے جب کہ غیر اسلامی نظریات میں نہ تو علم کے متعین کنارے ہیں اور نہ حقیقی فلاح کی جانب سمتِ سفر "علم برائے علم" اور "ہر علم محمود و مستحسن" ان کے نعرے ہیں۔

مندرجہ بالا اسلامی بنیادوں کی روشنی میں، قرآنی اقدار سے مزین اور علم وحی سے سیراب و مستفاد علم "العلم" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ورنہ قرآن مجرد علم کو سندِ عظمت عطا نہیں کرتا چنانچہ اس کے نزدیک اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ نفسِ علم اور علم کا استعمال دونوں صحیح ہوں۔

---

۱ مزید ملاحظہ ہو: الانعام: ۱۶۶ - فاطر: ۳۹

۲ ملاحظہ ہو، البقرہ: ۳۴ - بنی اسرائیل: ۷۰ - التین: ۴

۳ مزید ملاحظہ ہو، الجاثیہ: ۱۳ - النحل: ۱۲، ۱۴

۴ مزید دیکھیں: البقرہ: ۲۱-

اسلامی انقلاب اور ہمارے فرائض

جناب غلام فرید بھٹی صاحب

(۳)

۱۲ — **مسلح افواج** | ہماری مسلح افواج ملک کے استحکام اور دفاع کا ایک اہم ستون ہیں — جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ ساتھ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی ان کے فرائض میں شامل ہے۔ فوجوں کی اسلامی تربیت ہی ان میں زبردست جذبۂ جہاد، شوقِ شہادت اور مجاہدانہ سرفروشی کا ذوق پیدا کرے گی۔

جب تک ہم اُن سرچشموں کی طرف توجہ نہیں دیں گے، جن سے یہ جذبات نکلتے ہیں۔ اُس وقت تک ہم ایک اسلامی فوج کے کارناموں کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

اس کا سب سے بڑا سرچشمہ تو وہ مسلمان مائیں ہیں، جو ان مجاہدین کے کانوں میں خدا اور رسولؐ کا نام ڈالتی ہیں۔ وہ مسلمان معاشرہ ہے جس کی روایات اُن کے دل و دماغ میں خدا، رسولؐ، آخرت، جہاد اور شہادت کے تصور بٹھا دیتا ہے۔ اسلام کی محبت اور اس کی روایات کا بیج بوتا ہے، مگر یہ چیزیں ابھی تک مکمل طور پر ہماری فوجی تربیت کے نظام میں شامل نہیں ہو سکی ہیں۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے بچے کھچے کچھ نہ کچھ اثرات موجود ہیں جو آڑے وقت میں ہمارے کام آتے رہتے ہیں۔ اگر ہم مسلسل اس معاشرے کو بھی بگاڑتے چلے گئے تو یہ اثرات بھی آخر کب تک چلیں گے! آئندہ نسلوں کے لیے یہ نعمت کم سے کم تر ہی ہوتی چلی جائے گی۔

ہماری درس گاہوں میں اب جو خواتین تیار ہو رہی ہیں ان کی گودوں میں پرورش پا کر نکلنے والے نوجوانوں میں اِن اثرات کے باقی رہ جانے کی کم ہی اُمید کی جاسکتی ہے۔ یہ اثرات تو انہیں لوگوں میں پائے گئے ہیں جنہوں نے اپنے گھروں میں اپنی ماؤں کو نماز اور قرآن پڑھتے دیکھا تھا۔ جنہوں نے اُن سے خدا اور رسولؐ کا نام سُنا تھا، مگر جو نسی مائیں اب تیار ہو رہی ہیں، اُن کے ہاں تو مرد و زن کی مخلوط مجلسیں، فیشن پرستی، فلم ایکٹرسوں اور ٹیلی وژن آرٹسٹوں کے قصے، وی سی آر پر دیکھی جانے والی انگریزی، ہندوستانی یا مخرب الاخلاق فلموں پر تبصرے ہوتے ہیں۔ کھیل تماشوں اور ٹی وی ڈراموں کی گفتگو ہوتی ہے، مگر خدا اور رسولؐ کا نام مشکل ہی سے ان کی زبانوں پر کبھی آتا ہے۔

اِن کی گودوں سے جو نوجوان پرورش پا کر نکلیں گے کیا ان سے آپ توقع کرتے ہیں کہ پھر وہ خدا اور رسولؐ کے نام پر جانیں دیں گے اور ان کے اندر شہادت کے وہ تصورات ہوں گے جو پہلے زمانے کے مجاہدوں میں پائے جاتے تھے جن کی وجہ سے انھوں نے شاندار قربانیاں دیں؟

اگر ہم فی الواقع اس مُلک کے لیے اور اس مُلک کے نظامِ زندگی کے لیے کٹ مرنے والے نوجوان تیار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی فوجی تربیت کے ساتھ اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی اصلاحی تربیت دینے کی فکر بھی کرنی چاہیے، جو دلوں میں ایمان کو گہرا بٹھا دے اور اِن عقائد اور اخلاقیات کو نشو و نما دے جن کی طاقت سے وہ آئندہ اس سے بھی زیادہ قربانیاں دینے کے قابل ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمیں اپنے سے کئی گنا زیادہ بڑے دشمن کے مقابلہ میں زندہ رکھ سکتی ہے، بلکہ ہمارے اندر ایسی ناقابلِ تسخیر قوت پیدا کر سکتی ہے کہ ہم چاروں طرف سے اعداء میں گھرے ہونے کے باوجود اپنے چھوٹے سے ملک کو محفوظ بھی رکھ سکتے ہیں اور اسے جنوبی ایشیا کے علاقے میں پوری پوری اہمیت بھی دلوا سکتے ہیں۔

مسلح افواج میں تربیت کے مختلف مراحل ہیں۔ فوج کی اسلامی تربیت کے لیے ہمیں ان تمام مراحل کی طرف ہی خصوصی توجہ دینا ہوگی۔

فوجی بھرتی کے مختلف مراحل میں فوج میں آنے والے نوجوانوں کے اسلامی رجحانات اور اسلامی علم و فہم کے بارے میں جائزہ لینے کا کوئی مناسب نظام ہونا چاہیے تاکہ مسلح افواج میں زیادہ سے

زیادہ ایسے نوجوان آسکیں جو اسلامی روایات اور اسلامی جذبے اور محبت سے سرشار ہوں
اُن کے لیے بنیادی ٹسٹ، انٹرویو کا مرحلہ، نفسیاتی جانچ، شخصیت اور ذہانت کا جائزہ اور
دیگر تحریری اور زبانی ٹسٹ کچھ اس طریقے سے وضع کیے جائیں کہ پہلے مرحلے میں ہی نوجوان کی
اسلامی ذہنیت، اسلامی علوم پر اس کا مطالعہ اور اسلام سے اس کا لگاؤ نکھر کر سامنے
آجائے۔ اِن مراحل میں نوجوانوں کا امتحان لینے والے افراد میں بھی اسلامی فکر و کردار کا ہونا
بہت ضروری ہے۔

منتخب ہونے کے بعد فوجی نوجوان جن تربیت گاہوں میں اپنی بنیادی یا اعلیٰ تربیت کے لیے
جاتے ہیں ان تربیت گاہوں کا اسلامی نقشے پر ڈھلا ہونا بڑا ضروری ہے، ورنہ یہ تربیت گاہیں
مسلمان جرنیل پیدا نہ کرسکیں گی۔ اِن تربیت گاہوں میں پڑھایا جانے والا مواد، اس مواد کو
پڑھانے والے اساتذہ، زیرِ تربیت نوجوانوں کے استفادے کے لیے لائبریریوں میں موجود درسی
اور غیر درسی کتب اور ان تربیت گاہوں کا وہ اندرونی ماحول جن سے نوجوانوں کو کتاب کے علاوہ
ہر وقت واسطہ پڑتا ہے، اُن سب کی طرف خصوصی توجہ دینا ضروری ہے، تاکہ وہ تمام عوامل مل کر
ایک نوجوان کی تکنیکی تربیت کے ساتھ ساتھ نظریاتی تربیت کے لیے بھی پوری طرح مددگار ثابت
ہوسکیں۔

اِن درس گاہوں سے نکلنے کے بعد جب ہمارے نوجوان اپنی اپنی یونٹوں میں واپس جاتے ہیں تو یہ
یونٹ ان کے لیے ایک اہم تربیتی ادارہ بن جاتا ہے۔ یونٹ کمانڈر کی شخصیت، نوجوان کا یونٹ
میں موجود تدریسی عملہ، یونٹ میں اس کے دوسرے ساتھی، یونٹ کی لائبریری، یونٹ کی مسجد
اور مولوی صاحب، نوجوانوں کا میس اور کلب سب مل کر اس کی تربیت میں لگ جاتے ہیں۔ اور
پھر ساری عمر مستقل طور پر لگے رہتے ہیں۔ اسلامی فوج کے اسلامی جرنیل پیدا کرنے کے لیے
ہمیں ان اداروں کو مسلمان بنانے کی طرف بھی خصوصی توجہ دینی چاہیے تاکہ وہ نوجوانوں کی اسلامی
تربیت کرنے اور اُس کی اسلامی ذہنیت نکھارنے میں پوری پوری مدد دے سکیں۔

یونٹ میں آنے کے بعد نوجوان کو اعلیٰ عہدوں پر ترقی دینے کے لیے مختلف قسم کے امتحانات
دینا ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کو اسلامی مضامین کے مطالعے کی عادت ڈالنے کے لیے ان امتحانوں

کے لیے مجوزہ تدریسی مواد میں اسلامی مضامین کو شامل کیا جائے تاکہ کوئی نوجوان ان اسلامی مضامین کے لازمی مطالعہ کے بغیر کسی بھی اعلیٰ عہدے تک پہنچنے کا تصور بھی نہ کر سکے۔

اعلیٰ عہدوں پر ترقی کے سلسلے میں سالانہ خفیہ رپورٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس رپورٹ میں نوجوان کی سالانہ کارکردگی کا مختصر اظہار ہوتا ہے۔ اس رپورٹ کی طرف خصوصی توجہ دی جائے اور اس رپورٹ میں مزید ایسے کالموں کا اضافہ کیا جائے جن میں نوجوان کی اسلامی نقطۂ نظر کے لحاظ سے کارکردگی کا بڑی وضاحت سے اظہار کیا جائے۔ جیسے مبادیاتِ دین کا مطالعہ، اسلامی تاریخ کا مطالعہ، اسلام سے محبت، نماز باجماعت کی عادت وغیرہ۔ ایسا کرنے سے نوجوان یقیناً اسلامی علوم اور دین کے مطالعے کی طرف توجہ دیں گے اور اسلام کے اصولوں کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ان باتوں کا ان کی سالانہ رپورٹوں میں زیادہ سے زیادہ اظہار ہو سکے۔

اسی طرح اعلیٰ عہدوں پر ترقی کا معیار نوجوانوں کی تکنیکی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی روزمرہ زندگی میں ان کے اسلامی رجحانات کے اظہار کو بھی قرار دیا جائے۔ ملٹری ہسٹری کے مضامین میں تاریخِ اسلام کی بڑی بڑی جنگوں، ہمارے ابتدائی اور دورِ مابعد کے جرنیلوں کے کارناموں اور ان کی حکمتِ عملی کو بھی شاملِ نصاب کیا جائے۔

سروسز بک کلب کے ذریعے نوجوان افسروں کے ذاتی مطالعے کے لیے جو کتب تقسیم ہو رہی ہیں، ان میں مبادیاتِ اسلام، اسلامی نظامِ زندگی کے بنیادی تصورات، اسلامی تاریخ، مسلمان جرنیل، مسلمان سائنسدان اور اس قسم کے دیگر عنوانات بھی شامل کرنا چاہئیں۔

اسی طرح یونٹ لائبریریوں، آرمی اسٹیشن لائبریریوں، آرمی میس لائبریریوں، اور تربیت گاہوں اور آرمی کی درس گاہوں میں واقع لائبریریوں میں اسلامی مضامین پر مبنی کتب شامل کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

مسلح افواج کے نوجوانوں میں مذاکروں یا (STUDY PERIODS)، مباحثوں، تقریری مقابلوں، مضامین لکھنے کے مقابلوں، کوئز پروگراموں اور اسی قسم کے دوسرے طریقوں سے اسلامی رجحانات کے فروغ اور مطالعے کا شوق پیدا کیا جائے۔

مسلح افواج سے وابستہ ہر افسر اور جوان کا فرض ہے کہ یونٹ کے علاوہ وہ اپنے گھروں کی طرف بھی خصوصی توجہ دیں۔ اپنی نجی زندگی میں اسلامی اُصولوں کے عملی نمونے پیش کر کے انہیں اپنی اولاد اور بیگمات کی راہنمائی کا فرض ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ گھر ہی وہ بنیادی اکائی ہے جہاں آج کے بچے پرورش پا کر کل کے لیے نوجوان بنیں گے۔ مسلمان ماؤں کی گود سے ہی مسلمان جرنیل کا خمیر بن کر اُٹھے گا۔ اچھی مائیں ہی اچھے انسانوں کو جنم دیں گی اور اچھے انسان ہی اچھے سپاہی اور اچھے افسران بنیں گے۔

ماں کی گود اور گھر انسانوں کے لیے پہلی تربیت گاہ ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا گویا مستقبل کی قوم کو نظر انداز کرنا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ مجھے ایک اچھی ماں دیں، میں آپ کو ایک اچھی قوم دیتا ہوں۔

لہٰذا ہمارے گھروں میں عورتوں اور بچوں کی اسلامی خطوط پر تربیت کرنا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا یونٹ اور دوسری درس گاہوں میں نوجوانوں کی تربیت کرنا۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مسلح افواج میں اپنے دین سے زیادہ گہری محبت و وفاداری پیدا کرے اور اسلام کی حفاظت اور اِس ملک کی بقا اور سلامتی کے لیے ایسے کارہائے نمایاں انجام دینے کی توفیق دے کہ آنے والی نسلوں کا سر فخر سے ہمیشہ کے لیے بلند ہو جائے۔ آمین۔

اسلام میں اختلاف کے آداب

(۷)

فقہاء کا اختلاف اور اس کے آداب (۱)

ترجمہ وتلخیص: جناب عبدالحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

صحابہ وتابعین کی طرح ائمۂ فقہ کے درمیان بھی کئی اجتہادی مسائل میں اگرچہ اختلاف رونما ہوا، مگر ان کے اختلافات کے پیچھے ان کی ذاتی خواہشات یا افتراق و انتشار پیدا کرنے کا کوئی دانستہ جذبہ کارفرما نہ تھا، جس کی وجہ سے یہ حضرات راہِ ہدایت سے کبھی بھی ہٹنے نہ پائے۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد چونکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول اور حق تک رسائی ہوتا تھا لہٰذا ہر دور کے اہلِ علم کے لیے اجتہادی مسائل میں فتوٰی دینے کی صلاحیت و اہلیت کے حامل مفتی حضرات کے فتاوٰی سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا، البتہ ان کے خیال میں اگر فتوٰی درست ہوتا تو اُسے درست قرار دیتے اور اس میں کسی خامی کی صورت میں ان کے لیے استغفار کرتے اور ان کے بارے میں حُسنِ ظن سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح قاضیوں کا تعلق خواہ کسی بھی مکتبۂ فکر اور مسلک سے ہوتا، ان کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ضرورت پیش آنے پر خود قاضی اپنے خاص مسلک کے خلاف بھی فیصلے کرتے تھے اور ایسا کرنے میں کوئی حرج یا تنگی محسوس نہ کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان تمام حضرات کے دلائل اگرچہ مختلف ہوتے مگر وہ جس سرچشمہ سے سیراب ہوتے تھے، اس کا منبع ایک ہی تھا۔ ان کی احتیاط کا یہ عالم

تھا کہ رائے یا اجتہاد کا اظہار اس طرح کے الفاظ میں کرتے، جیسے: "ہٰذا احوط" (میری محتاط رائے یہ ہے) یا "ہٰذا احسن" (میرے خیال میں یہ بہتر ہے) یا "ہٰذا ما ینبغی" (یہ مناسب معلوم ہوتا ہے) یا "نکرہ ہٰذا" (ہمیں یہ بات اچھی نہیں لگتی) یا "لا یعجبنی" وغیرہ۔ اس طرح نہ تو کسی پر کوئی تنگی ہوتی اور نہ ہی الزام و اتہام تراشی۔ اسی طرح ایسی کسی رائے کے اظہار پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی، جس کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل موجود ہو۔ بلکہ لوگوں کے معاملات میں آسانی پیدا کرنے کے لیے پوری پوری وسعت اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

اختلافی مسائل کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ صحابہ و تابعین اور بعد کے فقہا میں سے کچھ حضرات بسم اللہ پڑھ کر نماز شروع کرنے کے قائل تھے۔ جب کہ کچھ حضرات ایسا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، کچھ اسے بلند آواز میں پڑھتے تھے اور کچھ آہستہ، فجر میں کچھ لوگ دعائے قنوت پڑھتے تھے، کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ بعض کی رائے تھی کہ نکسیر پھوٹنے، قے آنے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جب کہ دیگر حضرات اس رائے کے قائل نہ تھے۔ بعض کی رائے کے مطابق عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور بعض کے ہاں نہیں ٹوٹتا۔ اونٹ کا گوشت یا کوئی ایسی چیز جسے براہِ راست آگ نے چھوا ہو اس کے کھانے سے کسی کے ہاں وضو کرنا ضروری تھا اور کسی کے ہاں نہیں تھا۔

اس کے باوجود تمام حضرات ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ جیسے مدینہ منورہ کے مالکی اور دیگر ائمہ باوجودیکہ بسم اللہ نہ تو جہراً پڑھتے تھے اور نہ ہی سراً مگر امام ابوحنیفہؒ خود اور ان کے ساتھی نیز امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ، ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دن سینگی لگوانے کے بعد امامت کی، اور امام ابویوسفؒ نے بھی اس کی اقتدا میں نماز ادا کی اور بعد میں نماز کو لوٹایا نہیں حالانکہ ان کے مذہب میں پچھنے لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک تھا کہ نکسیر پھوٹنے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ اگر وضو کرنے کے بعد امام کے بدن سے خون نکلے اور وہ دوبارہ

وضو نہ کرے تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ آپ نے جواب دیا: امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ (جیسے اماموں) کے پیچھے میں نماز پڑھنے سے کیسے گریز کر سکتا ہوں؟ (ان دونوں حضرات کے ہاں خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا)۔

امام شافعیؒ صبح کی نماز میں دعائے قنوت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کے مزار کے قریب والی مسجد میں اُن کو صبح کی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے دعائے قنوت نہیں پڑھی، جب اُن سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "کیا اُن کی موجودگی میں میں اُن کے مسلک کی خلاف ورزی کی جرأت کر سکتا ہوں؟ پھر کہا: کبھی کبھی ہم اہلِ عراق کے مذہب پر بھی عمل کر لیتے ہیں[1]۔

فقہاء میں امام مالکؒ اہلِ مدینہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں ثقہ اور مستند سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں، اور عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور فقہائے سبعہ[2] کے اقوال کا بھی انہیں سب سے زیادہ علم تھا۔ آپ اور آپ جیسے دیگر فقہاء کے ذریعے ہی علمِ روایت و فتویٰ کی بنیاد پڑی۔ آپ نے حدیث و فتویٰ کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور اپنی کتاب "المؤطا" تالیف کی جس میں اہلِ حجاز کی قوی روایات، صحابہؓ کے ثابت شدہ اقوال اور تابعین کے مستند فتاویٰ جمع کر دیئے۔ آپ نے اپنی کتاب کو فقہی ابواب کے مطابق بڑی عمدہ ترتیب دی ہے جو آپ کی چالیس سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ تاریخِ اسلام میں حدیث و فقہ کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ امام کے ستر معاصر علماءِ حجاز نے اس کی تائید و توثیق کی۔ اس کے باوجود خلیفہ منصور نے جب اس کے چند نسخے تیار کروا کر دوسرے شہروں میں بھیجنے کا خیال ظاہر کیا تا کہ تمام لوگ صرف اس کے مطابق عمل کریں، تا کہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۳۵

[2] فقہائے سبعہ سے مراد ہیں: سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، سلیمان بن یسار، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود۔

اختلافات کا خاتمہ ہو، تو سب سے پہلے امام مالکؒ ہی نے اس تجویز کو رد کیا اور فرمایا:
" امیر المومنین! آپ ایسا نہ کریں، اس لیے کہ لوگوں تک اس سے پہلے بہت سے اقوال اور احادیث و روایات پہنچ چکی ہیں، ہر ایک نے اپنے تک پہنچنے والی روایت کو اپنا لیا، جس سے ان کے درمیان خود ہی اختلاف رونما ہو چکا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے جو چیز اختیار کر لی ہے اسی پر آپ انہیں چھوڑ دیں" خلیفہ منصور ان کا جواب سن کر مطمئن ہو گیا اور کہا: ابو عبد اللہ! اللہ آپ کو مزید توفیق بخشے۔ [1]

یہ کتنے جلیل القدر امام تھے جنہیں یہ بات ناگوار تھی کہ لوگوں کو صرف ان کی تالیف کردہ کتاب پر عمل کا پابند بنایا جائے۔ حالانکہ اس کتاب میں انہوں نے احادیث و اقوال کا وہ بہترین ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو اُن کے نزدیک مستند اور قابلِ اعتماد تھا۔ اور جس کے بارے میں اہلِ مدینہ اور معاصر علماء کی اتنی بڑی جماعت کو کوئی اختلاف بھی نہ تھا۔

فقہاء کے آدابِ اختلاف کے چند نقوش

امام مالکؒ فرماتے ہیں: "علمِ دین ایک ایسا علم ہے، جسے چار قسم کے لوگوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا: بیوقوف و احمق، نفس پرست جو گمراہی پھیلانے پر کمربستہ ہو، کذاب جو لوگوں کے معاملات میں دروغ گوئی سے کام لیتا ہو۔ خواہ روایتِ حدیث کے سلسلہ میں وہ متہم نہ ہو، اور ایسا شخص جو عابد و زاہد اور متقی تو ہو مگر اسے اس چیز کی صحت و ضعف کا علم نہ ہو جسے وہ بیان کر رہا ہے۔" [2]

نیز آپ نے فرمایا: یہ علم دراصل دین ہی ہے، اس لیے جس شخص سے اسے حاصل کر رہے ہوں اُس کے بارے میں غور و فکر سے کام لینا چاہیے۔ میں نے ستر علماء کو دیکھا جو مسجدِ نبوی کے ان ستونوں کے پاس بیٹھ کر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے تھے مگر ان میں سے کسی سے بھی میں نے کوئی روایت نہیں لی۔ ان میں سے کسی کو بھی اگر بیت المال کا نگران بنایا جاتا تو بلاشبہ وہ اس میں ذرہ برابر خیانت کے مرتکب نہ ہوتے،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۰۷ اور الفکر السامی ۱/۳۳۶

[2] الانتقاء ص ۱۶

مگر اس عظیم الشان کام کے وہ بہر حال اہل نہیں تھے۔ دوسری طرف ابن شہاب المشہور محدث امام زہری، جب ہمارے ہاں تشریف لائے تو آن کے دروازے پر ہر وقت علم کے متلاشی لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ ان صفات کے حامل افراد کے درمیان کوئی بڑا اختلاف رونما ہونا بعید از امکان تھا۔ اور اگر تھوڑا بہت اختلاف واقع ہوا بھی تو وہ صرف حق کے لیے ہوا کرتا تھا۔ ان کے دلوں میں ہوا و ہوس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ جن آدابِ اختلاف پر ہمارے علمائے سلف کاربند رہے ان کے چند نمونے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اپنے لیے ہم انہیں مشعلِ راہ بنا سکیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے فقہی مسالک میں جو فرق ہے وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ اسی طرح دونوں حضرات کے ہاں مروّج اصول و ضوابطِ اجتہاد کی بنیادیں بھی الگ الگ ہیں اور دونوں میں عمر کا بھی تفاوت تھا۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے احترام میں کوئی چیز مانع نہ ہو سکی۔ اور فقہ میں طریقۂ کار کا اختلاف ان کے دلوں میں باہمی محبت اور احترام میں کمی کا سبب نہیں بننے پایا۔

قاضی عیاض اپنی کتاب "المدارک" میں لیثؒ بن سعد کی زبانی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں امام مالکؒ سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ سے کہا: کیا وجہ ہے کہ میں آپ کو اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: ابوحنیفہ سے گفتگو نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا ہے اے مصری! وہ بلاشبہ فقیہہ ہیں۔"

امام لیثؒ نے کہا: اس کے بعد میں نے امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات کر کے کہا: اس شخص نے (اشارہ امام مالک کی طرف تھا) آپ کے بارے میں کتنی اچھی بات کہی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: "صحیح جواب دینے اور بھرپور تنقید کرنے میں ان سے تیز خاطر آدمی میں نے نہیں دیکھا۔"[2]

---

[1] الانتقاء ص: ۱۶ [2] ایضاً

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ایک روز میرا اور محمد بن الحسن کا مباحثہ ہوا، بات بڑھتے بڑھتے اختلاف کی حد تک پہنچ گئی - حتیٰ کہ یوں محسوس ہونے لگا گویا ان کی رگیں پھٹ پڑیں گی - اور بٹن ٹوٹ جائیں گے ''[1]

امام محمدؒ کہتے ہیں: " اگر کبھی اختلافی مسائل میں ہم پہ کوئی شخص حاوی ہوا تو وہ شافعیؒ کے سوا کوئی اور نہیں'' ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: " ان کے زور بیان اور غور سے بات سن کر پورے اعتماد و یقین کے ساتھ سوال و جواب کرنے کی خوبی کی بنا پر"[2]

علمائے امت کے آداب اختلاف کے ان نمونوں سے یہ نتائج نکلتے ہیں کہ قرونِ خیر میں بعد میں آنے والے حضرات نے اسلاف کے نقشِ قدم پہ چلنے اور ادب نبویؐ سے فیض یاب ہوتے رہنے کو اپنا شعار بنا لیا تھا - سلف صالحین آدابِ اختلاف میں صرف طنز و تعریض سے اجتناب نہیں کرتے تھے، بلکہ اس دور میں حصولِ علم پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے اور غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرنا ان کا شیوہ بن چکا تھا - نیز وہ نادانستہ غلطی کے ارتکاب کے خوف کی بنا پہ فتویٰ دینے سے احتراز کرتے تھے۔

مؤلف " القوت" عبدالرحمٰن بن ابی لیلی کی ایک روایت نقل کرتے ہیں، جس میں انہوں نے بیان کیا: اس مسجد میں (اشارہ مسجد نبوی کی طرف ہے) میں نے ایک سو بیس صحابہؓ کو اس حال میں دیکھا کہ ان میں سے کسی سے اگر کوئی حدیث یا فتویٰ پوچھا جاتا تو اس کی یہی خواہش ہوتی کہ کوئی دوسرا بھائی ہی اس کے متعلق بتلائے - بالفاظِ دیگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ دوسرے کے پاس بھیجتا اور وہ کسی اور کے پاس، اس طرح سائل گھومتے ہوئے پھر اس شخص کے ہاں واپس پہنچتا جس سے پہلی مرتبہ اس نے سوال پوچھا تھا[3]

اس سلسلے میں وہ سبکی یا شرمندگی کے جذبات و احساس سے بالا ہو چکے تھے - یہ غلطی کا خدشہ

---

[1] الانتقاء ص: ۱۶

[2] ایضاً ص ۸۰

[3] اتحاف السادۃ المتقین ۱/ ۲۷۹ — ۲۸۰

ہی تھا، جو انہیں بعض اوقات کسی مسئلے کے جواب میں توقف پر مجبور کر دیتا تھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص امام مالکؒ سے کوئی مسئلہ پوچھنے کے لیے حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس کی قوم نے اسے یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے ایسی جگہ سے بھیجا ہے جس کا فاصلہ یہاں سے چھ ماہ کا ہے۔ آپ نے کہا: جس نے تمہیں بھیجا ہے اس سے جا کر کہہ دو کہ میں یہ مسئلہ نہیں جانتا۔ اس شخص نے کہا: پھر اسے کون جانتا ہے؟ آپ نے فرمایا: "وہی جسے اللہ نے اس کا علم دیا ہے۔ ملائکہ نے کہا تھا "لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" البقرہ: ۳۲ (ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا تو نے ہمیں سکھایا ہے)۔

امام مالکؒ ہی کے متعلق یہ بھی مروی ہے کہ ان سے اڑتالیس مسئلے پوچھے گئے جن میں سے ۳۲ کے بارے میں آپ نے کہا "لا ادری" "میں نہیں جانتا"۔

خالد بن خداش کہتے ہیں: "میں عراق سے چالیس مسئلے معلوم کرنے کے لیے امام مالکؒ کے ہاں حاضر ہوا، جن میں سے آپ نے صرف پانچ کے جواب دیئے"۔

ابن عجلان کہتے ہیں: "اگر عالم "لا ادری" کہنا چھوڑ دے تو ہلاکت و بربادی اس کا مقدر ہوگا"۔

امام مالکؒ، عبداللہ بن یزید بن ہرمز سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "عالم کو چاہیے کہ اپنے ہم نشینوں کو "لا ادری" کہنا سکھائے تاکہ ان سے جب کسی ایسے مسئلے کے بارے میں سوال کیا جائے جس کا جواب انہیں معلوم نہ ہو تو وہ "لا ادری" کہہ کر اپنی جان بچا سکیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں: حضرت ابوالدرداءؓ سے یہ صحیح روایت مروی ہے کہ انہوں نے کہا: "لا ادری" کہنا آدھا علم ہے۔

(باقی)

بحث و نظر

سورۃ العصر کی تفسیر میں چند گذارشات

جناب امیر نواز صاحب مدرس۔ جامعہ عربیہ جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

(۱)

میں نے ترجمان القرآن مئی ۱۹۸۷ء کے شمارے میں پروفیسر آسی ضیائی صاحب کا مضمون — ایک سورۃ کی تفسیر پر کچھ "معروضات" — ملاحظہ کیں جن میں پروفیسر صاحب نے خلاصتہً یہ اشکال وارد کیا ہے کہ سورۃ العصر کی تفسیر جو مفسرین نے کی وہ دنیا کے حالات پر منطبق نہیں ہوتی، کیوں کہ اس تفسیر کا منشا یہ ہے کہ: زمانہ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اور حق و صبر کی وصیت کی۔

اب جس وقت ہم اس سورۃ کی اس تفسیر کو دنیا کے حالات پر منطبق کرتے ہیں تو ہمارے سامنے جو حالات آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ غیر مسلم اقوام بھی مادی نفع اٹھا رہی ہیں، بلکہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور خوشحال ہیں، تو وہ کیسے خسارے میں ہیں، اور دوسری طرف ایک آدمی اگر اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس پر بسا اوقات مصائب و مشکلات پہلے کی نسبت زیادہ ہو جاتی ہیں، تو ایمان والے کیسے خسارے سے بچ نکلے؟ بلکہ بظاہر تو وہ خسارے میں ہیں اور کفار خسارے سے بچے ہوئے ہیں۔

اس کا حل پروفیسر صاحب نے یہ نکالا ہے کہ سورۂ عصر میں "وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" الگ کلام ہے، جس کا سورۃ کے باقی حصہ سے کوئی تعلق نہیں ۔ یعنی اس حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں ۔ یعنی موت، فوت سے نہیں بچ سکتے، فنا ہو کر رہیں گے

زمانہ اس پر گواہ ہے۔
اور باقی سورہ کا اس سے استثنیٰ صحیح نہیں۔ بلکہ باقی سورۃ الگ ایمان والوں کے لیے بشارت ہے، اس کا زمانہ کی گواہی سے کوئی تعلق نہیں۔
ہماری گزارش یہ ہے کہ تفسیر وہی صحیح ہے جو تمام مفسرین نے کی ہے کہ زمانہ اس پر گواہ ہے کہ تمام لوگ خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اعمالِ صالحہ کیے اور جو تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اُصول پر قائم رہے۔
• اور پروفیسر صاحب نے جو خیال ظاہر فرمایا ہے وہ اس سورۃ کے مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔
اسے اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ یہ سورۃ تذکیر بایام اللہ کے قبیل سے ہے، یعنی ان تاریخی حالات و واقعات کے قبیل سے ہے جو قرآنِ کریم میں اس غرض کے لیے بیان ہوئے ہیں کہ اہلِ ایمان کے لیے باعثِ تسکین ہوں اور کفار کے لیے تہدید، یعنی زمانہ کی گواہی سابقہ تاریخ سے متعلق ہے اور آئندہ کے لیے تنبیہ بھی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ اے قرآن کے مخاطبین! زمانہ کی گردش اس بات پر گواہ ہے کہ سب لوگ خسارے میں ہیں ___ سوائے اُن خوش نصیبوں کے جنہوں نے مانا، اطاعت کی اور اپنی روش کو بہتر بنایا۔ خود حق کا ساتھ دیا اور دوسروں کو بھی حق کا ساتھ دینے کی وصیت کی، پھر حق کے لیے جو مصائب و مشکلات پیش آئیں، اُن کو جرأت مندی اور حوصلہ سے برداشت کیا اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کی۔ (یہ لوگ ہیں جو خسارے سے بچ نکلے ہیں)
اس کے برعکس جنہوں نے اللہ کے رسولوں کی دعوتِ حق کا انکار کیا اور اپنی بداعمالیوں میں مشغول رہے وہ تباہ و برباد ہوئے اور خسارے میں رہے۔ تو تم بھی اے قرآن کے مخاطبین زمانے کی اس گواہی سے سبق حاصل کرو اور رسول اللہ کی دعوتِ حقہ کو قبول کرو، ورنہ تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کا ہو چکا ہے۔
اسی تفسیر کی روشنی میں اب ان واقعات و قصص پر نگاہ ڈال لی جائے جو قرآن میں تذکیر و تبشیر کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً نوح علیہ سلام اور ان کی قوم، ہود علیہ السلام اور اُن کی

(قوم) قوم، صالح علیہ السلام اور ان کی قوم، لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم، شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم معرکۂ نمرود و خلیل علیہ السلام، معرکۂ فرعون و کلیم علیہ السلام۔

اور اگر دولت و اقتدار کو خسارے سے بچاؤ سمجھا جائے تو نمرود و فرعون کا اقتدار، قارون و ہامان کی دولت اور قریش کی سرداری بھی ملاحظہ فرمائیں۔

باقی جو تفسیر پروفیسر صاحب نے پیش فرمائی ہے کہ "والعصر ان الانسان لفی خسر" اور "الا الذین اٰمنوا" الخ بالکل بے وجود ہیں ـــــ اس سے قرآن کی ادبی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم وہ کتاب ہے جس نے دنیا بھر کے مخالفوں کو ادب کی بنا پر چیلنج دیا ہے۔

---

(۲)

سورہ "العصر" کے سلسلے میں آخری گذارش

جناب آسی ضیائی صاحب

مئی کے ترجمان القرآن میں سورۃ العصر پر میری گذارشات کے جواب میں اگلے ہی ماہ دو فاضل حضرات نے جو کچھ فرمایا، اس پر میں ان کا ممنون ہوں۔ میں نے اُن کا بغور مطالعہ کیا اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس سے میرے موقف میں کسی قدر تبدیلی آئی ہے۔ مگر اس تبدیلی نے میرے نقطۂ نظر کو اور بھی مستحکم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سابق مضمون میں بھی میں نے اہلِ علم سے ایک طالب علمانہ استفسار کیا تھا۔ اور اب بھی اس سے زیادہ میرا کوئی مقصد نہیں، البتہ اگر میری موجودہ معروضات کے جواب میں کچھ لکھا گیا اور اس سے میری تشفی نہ ہو سکی تب بھی میں اس موضوع کو مزید طول نہیں دوں گا۔ کیونکہ مناظرہ بازی میرے ذوق کے بھی خلاف ہے اور خود "ترجمان القرآن" کے بھی شایاں نہیں۔

میرا موجودہ تبدیل شدہ موقف یہ ہے کہ زمانہ جس بڑے خسارے پر گواہ ہے وہ موت نہیں، خود گزرتا ہوا زمانہ ہے، جو ہر آن مستقبل سے حال میں آتا ہوا ماضی بن رہا ہے، اور جو ایک بار نکل جائے تو ہرگز ہاتھ نہیں آتا، اور جس کے بھرپور استعمال کے باوجود، اس کے گزر جانے

کے بعد ہر شخص کو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکنے کا قلق رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک دنیادار عیاش، ایک کامیاب کاروباری، ایک مقبول شاعر، ایک عظیم فاتح، غرض ہر شخص اپنے گزرے ہوئے زمانہ کو حسرت ہی کے ساتھ یاد کرتا ہے، اور اس کے "ضائع جانے" پر کفِ افسوس ملتا ہے۔ حتیٰ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی ساری زندگی عبادتِ الٰہی میں گزری ہو، وہ بھی گزرے ہوئے زمانہ کے "خسارے" کا غم دل میں رکھتا ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو غالب نے بڑی خوبصورتی سے یوں کہا ہے ؎

ٹلتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

یہی انسان کا وہ خسارہ ہے جس پر العصر گواہ ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ گواہی آپ سے آپ اس استثناء سے باہر ہی باہر رہتی ہے، کیونکہ العصر کے خسارے کا احساس تو جیسا اوپر عرض کیا گیا ہے، اہلِ ایمان کو بھی رہتا ہے، اور اس سے جلیل القدر صحابہؓ تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہر بزرگ اپنے اخیر وقت میں یہی کہتا اور پچھتاتا سنا گیا ہے کہ اس نے آخرت کے لیے کچھ نہیں کیا۔[1] (مثالیں دینے کی ضرورت نہیں) بلکہ میرے خیال میں تو جو جتنا بڑے درجے کا ایمان وعملِ صالح وغیرہ کا سرمایہ رکھتا ہے وہ اتنا ہی ماضی پر متاسف اور مستقبل کی طرف سے فکرمند ہوتا ہے۔ اور یہ ذوقِ ایمان ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مطمئن ہو کہ اس نے آخرت کے لیے جو کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے وہ کافی ہے تو اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ اسی "فوتِ فرصتِ ہستی" کے غم کو غالب نے مزید خوبصورتی کے ساتھ یوں کہا ہے:

بے صَرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

---

[1] اور اسی کی طرف قرآن نے بھی جابجا اشارہ کیا ہے کہ بامراد اہلِ ایمان وہی ہیں جو "خشیتِ رب" سے کانپتے رہتے ہیں اور اسے "خوف اور طمع" کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس خوف و خشیت کی بنیاد وہی "فوتِ فرصتِ ہستی کا غم" ہی ہو سکتا ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ زمانہ ہر آن انسان کے خسارے میں ہونے کی گواہی دے رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس خسران کی تلافی آخرت میں کر دی جائے گی، بشرطیکہ وہ ان چار صفات سے آراستہ ہوں (یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر)

(۲) جناب نورالٰہی کا یہ کہنا کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے"۔ تو اس سے میں یا کوئی اور انکار کر کے مومن ہی کب رہ سکتا ہے؟ مگر اس حقیقی خسارے کی تلافی پر العصر کس طرح گواہ بن سکتا ہے — یہی میرا اصل سوال ہے۔ آج تک نہ تو زمانے نے یہ دیکھا کہ کافر کی موت پر آسمان سے ندا آئی ہو کہ یہ ابدی خسارے میں جا پڑا! اور نہ مومن صالح کی موت پر لوگوں نے فرشتے اترتے اور اس کی روح کو مبارکباد دیتے دیکھے کہ زمانہ اس پر گواہ بن سکے۔ اگر زمانہ اس ابدی خسران و فلاح پر گواہ ہوتا تو وہ کونسا کافر ہے جو ایمان نہ لے آتا؟ یہ سب امور انسان سے غیب میں رکھے گئے ہیں۔ اور اس سے اسی ایمان بالغیب کا مطالبہ کیا گیا ہے، جس کا صلہ ابدی فلاح عطا کیے جانے کی ضمانت دی گئی ہے۔

نورالٰہی صاحب نے مولانا فراہی کی تفسیر کا جو حوالہ دیا ہے وہ بھی میرے سوال کا جواب نہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ پچھلی قوموں نے "اگر نیکیاں کیں بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج و کمال بخشا۔ اگر انہوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا"۔ مگر مولانا نے سورہ کے استثنا کا سب سے پہلا اور سب سے اہم جزء "ایمان" نظر انداز کر دیا ہے۔ اور ایسا شاید انہوں نے قصداً کیا۔ کیونکہ ایمان نہ لانے والی قوموں نے بھی بعض بنیادی بھلائیاں اختیار کر کے دنیا میں عروج حاصل کیا ہے۔ اور جب وہ ان بھلائیوں سے تہی دامن ہو گئیں تو تباہی بلکہ فنا کے غار میں جا پڑیں۔ اس معاملے میں مومن و غیر مومن کی کوئی تخصیص نہیں ہے، قدیم بابلی، مصری، چینی، یونانی، رومن، سبائی اور دیگر قومیں، جن کے عروج کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ ایمان نہ لانے کے باوجود دنیا میں خوب پھولیں پھلیں۔ اور قریب کے زمانے میں یورپی اقوام، امریکہ اور روس وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ پھر خود ہی سوچیے کہ زمانہ صرف اہلِ ایمان کو اس خسارے سے محفوظ رہنے کی گواہی کس طرح دے سکتا ہے۔

اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر کا اقتباس بھی دعوے کی تردید نہیں کرتا۔ اگر

ایک کافر نے حضرت صدیق اکبرؓ سے یہ کہا کہ تم نے باپ دادا کا دین ترک کر کے لات و عزّیٰ کی عبادت چھوڑ کر اور ان دیویوں کی شفاعت سے ناامید ہو کر زیاں کاری کی ہے تو اس کا جواب حضرت صدیقؓ نے وہی دیا جو ایک سچا اور پکا مومن دے سکتا ہے کہ حق کو قبول کرنے والا خائب و خاسر نہیں رہ سکتا۔ یہ پُراعتماد جواب اللہ کے وعدے پر بھروسہ کر کے انھوں نے دیا، نہ کہ زمانے کو گواہ بنا کر۔ اور اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی گواہی کے علاوہ اپنا وعدہ پھر دہرا دیا۔

جناب نورالٰہی نے میرے اس دعوے کی بھی تردید کی ہے کہ آخرت میں العصر کا وجود نہیں ہوگا۔ یہ اگرچہ ایک غیر متعلق بحث ہے، مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی وضاحت کر دی جائے۔ موصوف نے جواب میں ایک فروگذاشت تو یہ کی ہے کہ "العصر" اور "الدہر" کو ہم معنی سمجھ کر سورۂ "دہر" کی پہلی آیت سے استدلال کیا ہے۔ حالانکہ "العصر" کا صحیح مفہوم وہ زمانہ گزراں ہے کہ جو ماضی، حال اور مستقبل پر منقسم ہوتا ہے، جب کہ "الدہر" اس کیفیت کا نام ہے جسے موجودہ اصطلاح فلسفہ میں "دورانِ خالص" (PURE DURATION) کہا جاتا ہے۔ بہرحال خواہ العصر ہو یا الدہر، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ زمانے کو ازلی ابدی سمجھنا قدیم ملحد یونانیوں کا فلسفہ تھا، جس کی تردید حکمائے اسلام نے کی ہے، اور موجودہ صدی میں تو اس کا تصور ہی بدل چکا ہے۔ اب تو "زمان" بھی طول، عرض اور عمق کی طرح "مکان" کی بُعدِ رابع (FOURTH DIMENSION) تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یعنی "مکان" کے ساتھ ہی "زمان" بھی ختم ہے۔ اور اگر کوئی مقام، اگر اسے "مقام" کہا جا سکے، "لامکان" بھی ہے جس کا ذکر اسلامی ادبیات میں بارہا آیا، اور آتا رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہاں "لازمان" بھی ہوگا۔

اس کے علاوہ زمان کا تصور اضافی بھی ہے اور اس امر کو بھی اب تسلیم کیا جا چکا ہے۔ انسانوں نے اسے اپنی سہولت کے لیے سالوں، مہینوں، گھنٹوں اور منٹوں وغیرہ میں تقسیم کر لیا ہے، ورنہ اس کی لمبائی یا اختصار کا تعلق بڑی حد تک ذہنِ انسانی کی مختلف اور بدلتی ہوئی کیفیات سے ہے۔ بقول اقبال:

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

بلکہ جوں جوں اقبال کا مطالعہ وسیع و عمیق ہوتا گیا، انہوں نے اس عقیدت کو فلسفیانہ طور پر بھی پیش کیا - اپنی نظم "نوائے وقت" میں زمانے کی زبانی وہ انسان سے کہتے ہیں:

ع در من نگری ہیچم، در خود نگری، جانم

اور ع از جانِ تو پیدایم، در جانِ تو پنہانم

اور "مسجد قرطبہ" میں ارشاد ہوتا ہے۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

پھر زیادہ کھل کر "لینن کی زبان سے خدا کے حضور عرض کرتے ہیں -

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

گویا میں نے اگر آخرت میں "العصر" کا ہونے سے انکار کیا تو یہ میری گھڑی اپج نہیں تھی -

دوسری فروگذاشت جناب نورالٰہی صاحب سے یہ ہوئی کہ زمانے کے وجود کو اس دنیا سے قبل اور مابعد ثابت کرنے کے لیے جن آیات کا حوالہ دیا ہے وہ متشابہات کی قبیل سے ہیں، مگر انہوں نے ان کے لغوی معنی ہی لے لیے ہیں: مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات چھ دن میں بنائی، یا قیامت کا دن انسانی حساب سے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، وغیرہ - حالانکہ ان سے مقصود فقط ذہنِ انسانی کو ذاتِ باری تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کا تصور دلانا اور اس عملِ خداوندی کی اہمیت جتانا ہے۔

ورنہ اگر متشابہات کو بھی ان کے لغوی معنوں میں لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا "نفس" (تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ) "دو ہاتھ" (بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ) "کئی آنکھیں" (وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا) "چہرہ" (كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ) "اس کا بادلوں کے سائے میں آنا" (اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ) وغیرہ کو بھی لغوی معنوں میں لینا پڑے گا۔ (تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَصِفُوْنَ) -

(۲)

اس سلسلے کے دوسرے مضمون میں میرے بزرگ اور محترم رفیق جناب نعیم صدیقی صاحب نے ایک نحوی گرفت کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اِلّا (حرفِ استثنا) سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلے تو بیان کردہ نوع یا گروہ کے تمام کے تمام افراد خسارے سے دوچار ہو جائیں گے اور اس میں نیک و بد کی کوئی تمیز نہ ہوگی۔ بعد میں اِلّا کے اقتضا کے تحت ایک جزء کو خسران سے نکال کر فلاح و نجاح سے سرفراز کر دیا جائے گا۔ بلکہ عربی زبان میں "اِلّا" مجموعی حکم کی زد میں آنے والی صف سے مستثنیٰ افراد کو پہلے ہی الگ نکال دیتا ہے" اور اس کی تائید میں موصوف نے کئی آیات پیش کی ہیں۔

اپنے موقف کی تائید میں مَیں بھی ایک اقتباس پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ سورۂ مدثر میں فرمایا گیا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّا أَصْحٰبَ الْيَمِينِ ۝ فِي جَنّٰتٍ ...... الخ (ہر نفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے، سوائے دائیں ہاتھ والوں کے، جو جنتوں میں ہوں گے) اگر نعیم صاحب کا اصول اس اقتباس پر بھی لاگو کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دائیں ہاتھ والے اپنے کسبِ اعمال سے پہلے ہی جنتوں میں پہنچا دیے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ بات قطعاً غلط ہے۔ دنیا میں اپنے اعمال درست رکھنے والے ہی اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت (نیز عقائد صحیح کے ساتھ ساتھ) جنت پانے کے حقدار ٹھہرائے جائیں گے۔ اسی لیے دنیا کا یہ دارالامتحان تیار کیا گیا ہے، اور انسان کو اس میں مہلتِ عمل دی گئی ہے۔ گویا فی الواقع ہر نفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے۔ البتہ ان میں سے جو نیک اعمال کی بدولت اپنا نفس رہن سے چھڑا لیں گے وہی اصحٰب الیمین ٹھہریں گے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ "اِلّا" کا استثنا ہمیشہ اسی طرح نہیں ہوتا جس طرح محترم نعیم صاحب کی پیش کردہ مثالوں میں آیا ہے۔ اسی لیے عربی قواعد میں بھی استثنا کی دو حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ متصل اور منقطع۔ اول الذکر کی مثال وہ ہے جو مَیں نے پیش کی، اور عبس کی مثال میرے نزدیک "العصر" کا استثنا بھی ہے، اور ثانی الذکر میں نعیم صاحب کی پیش کردہ مثالیں آجاتی ہیں۔

نعیم صاحب نے اس کے علاوہ جتنی بھی آیات سے اپنے موقف کو مزید تقویت دی ہے اُن

ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہوں - بات تو صرف غیر مسلم کو سمجھانے کی تھی - اور وہ العصر کی اس گواہی سے تو ہرگز انکار نہیں کر سکتا کہ انسان مسلسل خسارے میں زندگی گزارتا ہے، البتہ اہلِ ایمان کو مستثنیٰ کرنے کی گواہی بھی زمانہ ہی دے رہا ہے ؟ — یہ بات اگر صحیح ہوتی تو جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، کوئی کافر بھی ایمان لانے سے باز نہ رہتا - اور پھر اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی ہے، کیونکہ میں نے "موت" کے بجائے خود "گذرتے ہوئے زمانے" کو انسان کا خسارہ تسلیم کر لیا ہے، لہٰذا اس موضوع پر مزید قلم فرسائی کی حاجت نہیں رہی -

---

محترم پروفیسر آسی ضیائی صاحب نے مستفسرانہ انداز میں جو بحث چھیڑی تھی، اس کے سلسلے میں دو تین تحریریں شائع ہو چکی ہیں - اب ان کی آخری تحریر کے ساتھ اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے - (ادارہ)

مطبوعات

تاریخ نظریہ پاکستان | پروفیسر سید محمد سلیم ۔ ناشر: ادارۂ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان۔ ۸۔۱ے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔

تین سو بارہ صفحات کی کتاب، اچھے کاغذ، نفیس طباعت اور سبز ٹائیٹل کے ساتھ۔

قیمت: ۶۰/- روپے۔

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب خادمانِ دین، علمبردارانِ اردو، کارپردازانِ تعلیم اور محققینِ تاریخ سب کے محسن ہیں۔ انہوں نے جتنی کتابیں اب تک لکھی ہیں وہ وسیع اثرات رکھتی ہیں۔ تازہ کتاب تاریخ نظریۂ پاکستان سیاسی اور دینی اہمیت کے ساتھ تاریخی وزن رکھتی ہے۔ خاص اس موضوع پر پچھلے دو تین سال میں کئی کتابیں آچکی ہیں۔ مگر پروفیسر صاحب کے کام میں نئے پہلو ہیں۔ مثلاً وہ اپنی کتاب کے ذریعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نظریہ پاکستان کسی وقتی منفی ردِّعمل کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ جہاں اس کی بنیادیں مثبت ہیں وہاں وہ تناظر بڑا وسیع ہے جس سے پاکستان کا نظریہ اور اس کے لیے تحریک اٹھی۔ پاکستان مسلمانوں کی دو صد سالہ جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ سید صاحب کی نظر کی رسائی کہ انہوں نے آدم پر ہونے والی پہلی وحی سے دو قومی نظریہ کی بنیاد تلاش کر لی۔

پھر سید صاحب اسلامی اعتقاد و حکمت کی جھلک دکھاتے ہیں۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کی آمد کا حال لکھتے ہیں۔ اکبری دور میں جب اسلام میں مذہبی آمیزش کا دور شروع ہوا تو حضرت مجدد نے "رجوع الی القرآن والسنۃ" کی پکار کے ساتھ اس کا سختی سے توڑ کیا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں، مسلمانوں میں مذہبی اور قومی وحدت کی اس جبر پر سرکاری کوشش

کی سرکوبی ہوگئی۔ سید صاحب نے ۱۸ ویں صدی کے وسط میں مؤرخانہ شہادت سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو کتنا اخلاقی علو حاصل تھا (ص ۵۴)۔ پھر اہلِ پرتگال کے مظالم (ص ۵۷ - ۵۶)۔ پھر مسلمانوں کو دبانے کے لیے انگریزی تدابیر۔ پھر مسلمانوں کی مجاہدانہ سرگرمیاں، واضح رہے کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء کا یہ دور تاریخ اور کورسوں سے گم کر دیا گیا۔ پھر مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعلیم کا فرق، پھر جدید تعلیم کا دیا ہوا مغرب پرستانہ انداز فکر و نظر۔

اس کے ساتھ ساتھ انگریز، ہندو اور مسلمانوں کی سیاسی کشاکش کی پوری داستان بیان ہوئی ہے، جو بالآخر پاکستان کی تشکیل پر منتج ہوئی۔

کتاب ضروری حوالوں سے آراستہ ہے اور آخر میں مآخذ کی فہرست درج ہے۔

اندھیرے سے اُجالے تک ماہر القادری مرحوم۔ مرتب: طالب الہاشمی۔
ناشر: حسنات اکیڈمی - ۱۹-سی، منصورہ، ملتان روڈ لاہور ۱۸

ادیبِ طرح دار اور شاعرِ نغز گو ماہر القادری کے ۲۴ افسانوں کا یہ مجموعہ ہے جو فاران میں اپریل ۱۹۴۹ء سے جون ۱۹۵۱ء تک شائع ہوئے۔

ابتدائی بات تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جدید دور کا افسانہ جو پلاٹ وغیرہ کی کینچلی اُتار کر ہوا میں اُڑتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی ہزار نزاکتوں اور سلوگنوں کے باوجود پلاٹ والے ان افسانوں کی قدر و قیمت ختم نہیں کر سکا ہے، جن میں واقعات کی حرکت داستان کی مانند ہوتی ہوتی ہے۔ اور پلاٹ کے اجزا اور کردار انسانی معاشرہ کے اندر سے لیے گئے ہوتے ہیں — ماہر القادری کے ان افسانوں کو پڑھ کر مجھے غیر معمولی ذہنی تسکین ملی۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ پلاٹ سے خالی معمّاتی اور الجبرائی قسم کے جدید افسانوں میں ایک اہم چیز جب نہیں پا سکتے تو وہ ڈائجسٹوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ "تین عورتیں، تین کہانیاں" کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور ان کی نگاہوں میں سفرنامہ کی صنف اس لیے وقیع ہو جاتی ہے کہ وہ ایک طرح کے پلاٹ والا

افسانہ بن جاتی ہے۔ جدید دور کا ادیب سابق دور کی خدمات کے بارے میں بہت متعصب واقع ہوا ہے۔

ماہر القادری مرحوم کے یہ تمام دلچسپ افسانے اس معاشرتی اور تہذیبی کشمکش کا پس منظر رکھتے ہیں، جس کی شدت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ماہر صاحب نے ہر افسانے کے کردار، پلاٹ، مناظر اور انجام جدا جدا رکھے ہیں، مگر سب کے سب سبق آموز ہیں۔ سب سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک نگاہ کے ڈالے ہوئے بیج سے خیال کی سرزمین سے جنسی جنون کی عشق پیچاں کس طرح اُگتی، نشوونما پاتی اور کن تبدیلیوں تک پہنچتی ہے۔

کلیمی (کرفیو کی اوٹ میں) جس طرح کمیونزم کے لیے کام کرتا ہے، اس کا طرزِ فکر اور ذوقِ ہنگامہ خیزی اور پھر شراب اور پھر پناہ لینے والی مصیبت زدہ عورتوں میں سے نوجوان لڑکی کا نشانۂ ہوس بننا اور کلیمی کا اتفاقاً کرفیو میں گولی کھانا سبق در سبق کہانی ہے۔ پھر فریدہ کا قصہ جسے پرانے دور پردہ سے نکال کر جدید تعلیم تک لایا جاتا ہے ــــ اور اسی طرح باقی سارے افسانے خوب صورت پلاٹ اور انجام لیے ہوئے نتھری ہوئی زبان اور پُرلطف محاوروں اور ماہر صاحب کے خاص خاص لطیف جملوں سے آراستہ۔ کیا تعریف کی جائے۔

عورتوں کے متعلق ۵ کتابیں از منیر احمد خلیلی ۔ ناشر: دار النشر حسن البنا اکیڈمی، گلی نمبر ۸ علامہ اقبال کالونی (ڈھیری حسن آباد)، راولپنڈی۔

ہمارے دوست منیر احمد خلیلی درد دل اور غم ملت رکھنے والے نوجوان ہیں۔ ان کے سامنے اس وقت مغربی تہذیب کا اٹھایا ہوا سب سے بڑا فتنہ وہ ہے جو عورتوں کو اسلامی آئین و حدود سے نکال کر فرنگی ساحری کے زیر اثر لا رہا ہے۔ اس کی تباہیوں کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے چھوٹی چھوٹی ۵ کتابیں لکھی ہیں:

۱ــــ "عورت کو مرد کے خلاف آمادۂ بغاوت کرنا فطرت سے جنگ ہے"۔

۲ــــ عورت اور ملازمت ۳ــــ تحریک آزادیٔ نسواں کا حاصل۔

۴ — حوا کی بیٹی ۵ — مسلمان عورت کا اصل مسئلہ (زینب الغزالی کی تحریر کا ترجمہ)
کتابیں (پمفلٹ) اچھے جذبے سے لکھے گئے ہیں۔ ضروری معلومات سے آراستہ،
پیرایۂ اظہار بھی اچھا ہے۔ نہ قیمت کسی پہ درج ہے، نہ مفت تقسیم کرنے کا اعلان۔

جمہوریت کس لیے؟ عام انتخابات کیوں؟	محمد اکرم جوئیہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈووکیٹ۔ نصیر والہ۔ ضلع میانوالی۔ قیمت درج نہیں۔

محمد اکرم جوئیہ صاحب جیسے حساس نوجوان کا وجود قوم کے لیے نعمت ہے، جو پیش آمدہ مسائل کو مستقلاً سوچتے ہیں اور سوالات کے جوابات تلاش کرتے ہیں۔ پہلے پمفلٹ کی دلچسپ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں مغرب کی جمہوریت درکار نہیں، بلکہ ایسا نظام چاہیے، جو اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہو۔ دوسرے پمفلٹ میں محمد اکرم صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ مغرب کا دیا ہوا نظام انتخاب کبھی صحیح اور اچھے نتائج نہیں دے سکتا۔ یہ نظام کسی طرح کی اخلاقی حدود گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کا مقصد سرمایہ داری کا تحفظ ہے۔ دونوں پمفلٹوں میں جابجا اہم حوالے دیے گئے ہیں۔

ابوالائمہ کی تعلیم	مرحوم مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی مدیر النجم لکھنؤ۔

ناشر: ادارہ تحفظِ ناموسِ اہل بیت پاکستان اے، ۲۱۹۔ سی بلاک، حیدری شمالی ناظم آباد۔ کراچی ۳۳

۱۲، ۱۵ سال کی عمر میں النجم لکھنؤ کا مطالعہ کرتا رہا اور مولانا عبدالغفور صاحب سے بہت متاثر تھا، انہی کے رشحاتِ قلم سے اس پمفلٹ کے اوراق کی رونق ہے۔ ثابت یہ کیا گیا ہے کہ شیعہ اثنا عشری گروہ کی کتب سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے خلفائے ثلاثہ کی بیعت کی، ان سے وفاداری کی، ان کو مشورے دیے، پھر حضرت علیؓ کی صاحبزادی حضرت عمرؓ

کے نکاح میں تھیں (اس واقعہ کو مسخ کرنے کے لیے عجیب عجیب تاویلیں اور تحریفیں کی گئیں ہیں) حضرت علیؓ نے دوسری بیویوں کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹوں کے نام ابوبکر، عمر، عثمان رکھا اور یہ کربلا میں شہید ہوئے۔ ان امور کے ساتھ بہت سی دلچسپ تفصیلات۔

مگر اصل مسئلہ نہ حوالوں کا ہے، نہ دلائل کا۔ شیعہ سنی نزاع صدیوں پہلے کا ایک سلسلہ ہے۔ اور اسے ہمیشہ واقعاتِ زمانہ اور احوالِ پیش آمدہ سے ہٹا کر ماضی میں لے جایا جاتا ہے اس کے بعد بھی بہت ہی برائے نام مثالیں ایسی ہیں کہ کتابی بحثوں یا مناظروں سے متاثر ہو کر اُدھر کا آدمی اِدھر آیا ہو یا اِدھر کا اُدھر گیا ہو۔ اختلاف و نزاع کی آہنی دیوار ہے، کون اسے سَر کر سکتا ہے۔

قومی زبان ــــ بابائے اُردو نمبر	ادارہ: ادیب سہیل و کلیم الحسن نقوی۔ ناشر: انجمن

ترقی اُردو پاکستان۔ بابائے اُردو روڈ، کراچی۔ قیمت خاص نمبر ۱۰/- روپے۔ عام شمارہ ۵/- روپے۔ سالانہ ۵۰/- روپے۔

اُردو زبان بڑی تیزی سے پنپی، جڑیں چھوڑتی اور شاخیں پھیلاتی گئی۔ مگر انگریزی شہنشاہیت یوں بھی مسلمانوں کی ہر پسندیدہ چیز کو ترچھی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور زبان تو ثقافت و فنون سے لے کر سیاست و دین تک ہر چیز پر اثر انداز ہوتی اور اثر لیتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اُردو کے مقابلے میں ہندی کو اُبھارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ دونوں ہندو مسلم سیاست کے مقاصد و مسائل بن گئیں۔ اس وقت ہندی جس طاقت سے اُٹھ رہی تھی، اس کا احساس کرتے ہوئے کچھ اہلِ درد نے ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اُردو کی بنا رکھی اور ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق اس کے سیکرٹری ہو گئے۔

برصغیر کی مسلم شخصیتوں میں مولوی صاحب کی ذات عجیب و غریب ہے۔ فقط اُردو ہی اُردو کی خدمت ــــ پُرخلوص اور مسلسل خدمت نے انھیں ایک ایک اُردو دان کی محبت کا مرکز بنا دیا۔ مولوی صاحب کو تنقید نگاری اور خاکہ نگاری اور مکتوب نگاری میں غیر معمولی مقام ملا۔ انھوں نے کتابوں کی تقریظیں اور مقدمے بھی لکھے۔ ایک بڑا کام ان کا یہ ہے کہ لکھنے والوں سے

ضروری چیزیں لکھوائیں اور ترجمہ کرائیں ۔ اور پھر ترقیٔ اردو کی تنظیم کو تقسیم سے قبل ہی برصغیر میں شاخ در شاخ پھیلا دیا ۔ اور بعد میں بھی توسیع ہو رہی ہے ۔

مولوی صاحب کو کسی اور پہلو سے نہ جانچیے، بس "اردو والا" کی حیثیت سے دیکھیے، اردو اردو کہتے کہتے وہ عظمت کے ایک منارۂ بلند میں بدل گیا ۔

یہ نمبر مولوی صاحب کی تصویرِ ہستی کے مختلف رُخ اور ان کی خدمتِ اردو کی داستان کے کئی ابواب پیش کرتا ہے ۔

افسوس کہ ہماری حکومت نے اردو کو قومی زبان بنا دینے کے لیے تیس سال کی جو تھوڑی مہلت طے کی تھی ، اب دستوری ترمیم کے ذریعہ اسے اور آگے بڑھایا جانے والا ہے ۔ یا سرے سے لمٹ ختم بھی کی جا سکتی ہے ۔ کاش مولوی صاحب کو دوبارہ یہاں بلایا جا سکتا کہ وہ اکابرِ قوم کو شرم دلائیں ۔ یہ لوگ اسلام کی خدمت کی سعادت سے تو محروم کر ہی دیئے گئے ہیں ، ان سے اردو کو صحیح حیثیت دلانے کا کام بھی نہ ہو سکا ۔

ترجمان الحدیث (دو حصے) | مرتبہ سید محمود الحسن صاحب فاضل دیوبند ۔ مدرسہ جامع العلوم معصوم شاہ روڈ ملتان ۔ ناشر : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور (پاکستان)
قیمت حصہ اول ۳۶/- روپے ۔ قیمت حصہ دوم ۴۲/- روپے ۔

حدیث کے منتخب مجموعوں اور اُن کے اردو میں ترجموں کی بہت ضرورت ہے اور جماعت اسلامی کی توسیع کے ساتھ یہ ضرورت بڑھتی جاتی ہے ۔

میں جناب مؤلف کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں ۔ اور ان کے اس کام کو بھی میں نے پسند کیا ۔ انہوں نے اپنی سوچ بچار کے مطابق دس ابواب بنا کر مختلف عنوانات کی احادیث کو منتخب کر کے مرتب کیا ہے ۔ پھر ہر حدیث کا پورا ترجمہ دیا ہے ۔ اور پھر مختصراً اس کی اچھی طرح تشریح کر دی ہے ۔ یہاں تک کہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ اصحاب بخوبی بات سمجھ سکتے ہیں ۔ ابواب ایسے ہیں اور ان میں مسائل ایسے آگئے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی ہی زندگی کے

پریشان کن سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ ایسی کتابوں کو ہمارے ساتھی سبقاً سبقاً پڑھیں۔

ناشر سے یہ عرض کرتے کو جی چاہتا ہے کہ قرآن و حدیث اور اس کے منتخب مجموعوں اور ترجموں کی اشاعت کا زیادہ بہتر انتظام ہونا چاہیے۔ کیونکہ پبلیکیشنز کا وجود ہی اس مقصد سے ہے کہ دین کی بنیادی تعلیمات خوبصورت شکل میں آئیں اور مقبول ہوں۔

اسلام میں معاشی مساوات | رانا صابر نظامی - ناشر: ادارہ تفہیم الاسلام، قذافی مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۵۰۰ قیمت: ۲۶/- روپے

مؤلف نے یہ کتاب سرمایہ داری اور غربا کو بدحال رکھنے والے نظام کے خلاف بڑے جذبے سے لکھی ہے۔ ان کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ ہمارا پورا معاشرہ سرمایہ داری اور وڈیرہ ازم کی اونچی اونچی دیواروں سے بنے ہوئے اقتصادی جیل میں بند ہے جس کے داخلی دروبست پر سیاست دانوں کی آڑ میں بیوروکریسی برسر اقتدار بنی ہوئی ہے۔ اور جب کوئی پیچیدگی رونما ہوتی ہے تو وہ مارشل لا کو بلا لیتی ہے۔ چالیس سال سے ہمارے اقتصادی جیل کی کڑی حفاظت کی جا رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اہلِ دولت غریبوں اور محنت کشوں کو سواری بنائیں گے اور غریب پسیں گے۔

رانا صابر نظامی کی میں تحسین کرتا ہوں کہ اس خوفناک نظامِ ظلم کے خلاف ردِ عمل میں پڑ کر صابر نظامی کسی غلط نظریہ کی راہ پر نہیں پڑے بلکہ اسلام ہی کو سرچشمہ ہدایت بنا کر سوچا۔ اکثر جگہ ان کے اطلاقات درست ہیں، کہیں کہیں اخلاص کے باوجود ان کے جادۂ فکر میں پیچ و خم آئے ہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ کی سنگینی، گھمبیرگی اور آدم کُشی کے ساتھ ساتھ اہلِ فکر اور علماء کی اس کے متعلق کم توجہی نے رانا صاحب میں سیاسی اسٹیج کا سا جوشیلا اندازِ بیان پیدا کر دیا ہے۔

ایک دلچسپ اور مفید کوشش یہ کہ رانا صاحب نے اقبالؒ، سید قطب شہید، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور غلام احمد پرویز کے معاشی نظریات اور ان کی تحریروں کی نو لاکھ نقول کو شامل کتاب کر کے اپنے کیس کو مضبوط کیا ہے۔

اُردو ڈائجسٹ - آزادی نمبر ادارۃ : الطاف حسن قریشی اور معاونین - دفتر: ۲۱ ایکڑ اسکیم سمن آباد لاہور ۲۵ - قیمت فی شمارہ -/۱۵ روپے، چندہ سالانہ (ترسیل بذریعہ رجسٹری) -/۱۳۰ روپے

ہمارے ہاں کے ارباب ادب کے فن پارے جب لطیف اور اونچے اور عام آدمی کے لیے ناقابل فہم ہونے کے لحاظ سے تقریباً اوزون گیس کی شکل اختیار کر گئے تو ایک نئی صنفِ ادب اخباری اور ڈائجسٹ ادب کی نمودار ہوئی۔ اس ادب کی کہانیاں پرانے داستانی اور نئے واقعاتی اسلوب کے ساتھ اوسط درجے کے خواندہ آدمی کے لیے زیادہ کشش دار ہوتی ہے۔ اس طبقے کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نسیم حجازی کے ناول ہوں، اخبارات کے ادبی ایڈیشن اور ان کی کہانیاں ہوں، سفرنامے ہوں یا ڈائجسٹوں کے کچھ واقعاتی ورودادی اور کچھ پلاٹ والے قابلِ فہم افسانے ہوں اور اس طرح غزل اور نظم کی روایتی بنیادوں کو قائم رکھ کر غیر معانی خیالات سامنے لائے جائیں تو زیادہ لوگ ان کو پسند کرتے ہیں۔ پھر بہت سے ڈائجسٹوں کی عام سطح اتنی زیادہ تفریحی، جنسی اور غیر مقصدی ہو جاتی ہے کہ ان کے مقابل میں اردو ڈائجسٹ کا مقام بہت نمایاں ہے۔ جو نہ صرف ہماری ملّی روایات کا بلکہ اخلاقی قدروں کا پاسبان بھی ہے۔ نظریہ پاکستان کا محافظ بھی اور خوبصورت سادہ ادبی معیارات کا قدرشناس بھی۔

اردو ڈائجسٹ کا ہر شمارہ ضخیم اور متنوع ہونے کی وجہ سے اشاعتِ خاص ہی ہوتا ہے مگر اس مرتبہ تو ادارہ کی طرف سے یومِ آزادی (۶ ستمبر) کے حوالے سے آزادی نمبر پیش کیا گیا ہے اور یہ پہلے بھی ادارہ کی روایت ہے۔

رنگارنگ اور کثیر التعداد مضامین اور کہانیوں اور تراجم کی تفصیل دینا مشکل ہے بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے کی بہت سی اصناف اس میں شامل ہیں خصوصاً یومِ آزادی پر ایک خصوصی سروے کے تحت گیارہ سوالات کے جوابات معروف لکھنے والوں سے حاصل کر کے پیش کیے گئے ہیں۔

سرورق بہت خوشنما۔ ضخامت تقریباً سوا تین سو صفحات

انسان کا مقصدِ زندگی محمد شریف قاضی ۔ ناشر: شعبۂ دعوتِ اسلامی پاکستان رجسٹرڈ۔ ڈاک خانہ بھنڈ گراں ۔تحصیل کھاریاں ضلع گجرات ۔ قیمت: ۲۰/ روپے

قاضی صاحب پہلے "اسوۂ حسنہ" نامی کتاب پر صدارتی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ ۸۰ ابواب پر پھیلے ہوئے مباحث اتنے محدود تو نہیں کہ یہاں چار، چھ سطروں میں عرض کر دیئے جائیں۔ یوں سمجھیئے آغازِ تخلیق سے لے کر قیامت تک کے سارے مراحل کے دینی حقائق کو بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ جن و انس کا مقصدِ تخلیق لِیَعْبُدُوْنَ ہے۔ مگر پھر عبادت اور رب اور اِلٰہ، استکبارِ ابلیس اور آدم کے معرکہ اوّل سے لے کر دعوت، سیاست، معیشت، موت، حساب کتاب تک بے شمار دینی اصطلاحوں کا مفہوم سادہ اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔
اِس کتاب کا نقشِ اوّل سید اسعد گیلانی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ شبیر احمد منظر قدوسی، ادارہ صدائے سحر بنگلور ۴ کرناٹک انڈیا۔ قیمت: ۱۵/ روپے۔

بہت دنوں سے یہ خوبصورت کتاب لٹکی چلی آرہی ہے۔ آرٹ پیپر کا رنگین کور، اندر بہت اچھی کتابت اور چھپائی اور جابجا صاف تصویریں۔ پہلے کچھ تعجب سا ہوا۔ پھر جب کتاب کو پڑھا تو گرہ کھل گئی۔ ایرانی پروپیگنڈے کے جلوے ہیں، منظر صاحب کو بیکایک اپنے سیمینار کے لیے کلیم صدیقی صاحب نے لندن بلا بھیجا۔ ایرانی انقلاب کا جو البم کلیم صدیقی صاحب لندن میں دکھاتے ہیں وہ ایران میں بھلا کہاں مل سکتا ہے۔ دُنیا بھر کے دانش ور بزرگوں کی بلائی ہوئی کلاس کو کلیم صاحب ہر سال ایرانی انقلاب کا ذہنی ڈوز پلواتے ہیں۔ کچھ کو ہضم ہی نہیں ہوتا، کچھ کو اس سے سرور حاصل ہوتا ہے۔ اپنے اپنے ایمان کی بات ہے۔ یہ تو ۱۹۸۵ء کا چھپا ہوا ریکارڈ ہے سیمینار کا۔ البتہ اس کے ساتھ ایک مزے کی چیز ہے، کلیم صدیقی صاحب کے اپنے ابتدائی احوال اور اسلامی مقاصد سے انتہائی فرسٹریشن کے بعد ایرانی انقلاب کے ذریعے دورِ نو کا آغاز۔

قافلۂ انسانیت کی منزلِ مقصود

رسولِ اکرمؐ

مرتبہ

سیدہ اُمّ فاروق

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

- ○ عالمِ نسواں کے لیے رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں رہنمائی کے خطوط۔
- ○ خواتینِ جہاں کے لیے حقوق کا منشور اور فرائض کے نقوش۔
- ○ رسولِ اکرمؐ کی ازدواجی زندگی، پسند و ناپسند اور ذوقِ لطیف کے خدوخال

ضخامت: ۲۴۰ صفحات ○ سائز: ۲۳×۳۶/۱۶

زیرِ طبع۔

طلب فرمائیے۔ کالج کی طالبات کے لیے تحفہ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمان مارکیٹ اُردو بازار۔ لاہور

صدارتی ایوارڈ یافتہ

رسولِ اکرمؐ کی حکمتِ انقلاب

از: سید اسعد گیلانی

○ رب العالمین نے سامانِ زیست کے ساتھ مقصودِ زیست بھی خود بتایا ہے۔
○ رحمۃ للعالمین، جو سراپا کمالات، سراپا رحمت اور سراپا ہدایت برائے عالمین ہیں۔
○ دعوتِ اسلامی کی اصولی بنیادیں، مزاجی خصوصیات اور عمومی خدوخال کیا ہیں؟
○ حضورؐ کا انقلاب آفریں اسلحہ، معجزۂ کردار، معجزۂ قرآن اور معجزۂ کلام ہے
○ حضورؐ کی حکمتِ انقلاب، فرد کی تیاری، تنظیم کی تربیت، ہجرت کی مورچہ بندی اور جہاد میں مضمر ہے۔
○ متوازن اسلامی انقلابی معاشرہ سات اجتماعی ستونوں پر قائم ہے۔
○ اسلامی انقلاب سات حکمتوں پر مبنی ہے۔
○ رسولِ اکرمؐ کی حکمتِ انقلاب کی ۵۳ تدابیر کا مؤرخانہ تذکرہ ناقابلِ فراموش علمی بحث ہے۔
○ تاریخِ انسانی کا جامع ترین انقلاب جو واحد حقیقی انقلاب ہے۔

○

یہ کتاب ان حکمتوں کو زیرِ بحث لاتی ہے، جن پر عمل کر کے دنیا کے ہر معاشرے میں اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

ضخامت: ٦٨٠ ○ نقشے ٤ ○ تصاویر متعدد

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ - رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور